دِل نامہ

اِنشائیے (اُردو)

راجہ نذرؔ بونیاری

قلب و قلم پبلشرز
ترکانجن بونیار، بارہمولہ

دِل نامہ

(اِنشائیے)

راجہ نذر بونیاری

(C) جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

کتاب کا نام: دِل نامہ

نوعیت: انشائیے (اُردو)

مصنف: راجہ عبدالقیوم خان

قلمی نام: راجہ نذؔر بونیاری

موبائل نمبر: 9697428024

ای میل:

سنِ اشاعت: ۲۰۱۹ء

کمپوزنگ تزئین: عبدالواحد منہاس

سرورق: بشیر احمد بصیؔر

تعداد: پانچ سو (۵۰۰)

قیمت: ۴۰۰ روپے

چھاپہ خانہ: کلاسِک پرنٹرس، جموں

Dil Namma

By: Raja Nazer Bunyari

Year of Edition: 2019

Price: Rs.400/-

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے مرحوم و مغفور والدین کے نام معنون کرتا ہوں، جنہوں نے مجھے گھٹنوں چلنا سکھایا، زبان و بیان کا علم دیا اور قلم ہاتھ میں تھما کر عبد القیوم خان سے ''نذر بونیاری'' بنا دیا۔ اللہ مرحومین کو جنّت الفردوس عطا کرے آمین!

فہرست

عرضِ ناتمام ---------- پروفیسر ظفر حسین ظفرؔ ۶

مقدمہ ---------- نور شاہ ۱۰

ہم بھی کچھ لکھنے کے تہمت بردار بن گئے۔ راجہ نذرؔ بونیاری ۱۲

انشائیے

خواب نامہ ۱۴

افرابنامِ تفری ۲۲

چین ۲۵

دوسرا چین ۳۲

نمک ۳۸

ہاتھ ۴۲

سالے ۴۷

کُرسی ۵۱

ماں ۵۸

بولی ۶۵

- کیوں نہ جنت کو جہنم میں ملالیں یا ربّ ۶۹
- حکیم صاحب کی "الحیات" سے سکندر کے "آبِ حیات" تک ۷۳
- مکھی ۷۷
- ناژن ۸۱
- گرم دل، نرم دل، دھرم دل، بے شرم دل ۸۶
- سیاست ۹۵
- بغداد کی حسینہ سے سونہ مرگ کی بکری تک ۱۰۳
- ناک، کان، آنکھ ۱۰۸
- بچپن ۱۱۴
- چور ۱۱۸
- قصائی ۱۲۲
- ننگا درزی ۱۲۸
- پیزار، ایزار، دستار ۱۳۳

عرض ناتمام

جناب نذر بونیاری کی طرف سے ان کی تصنیف ''مٹھی نچھ'' (پہاڑی انشائیے اور افسانے) پر کچھ تحریر کرنے کا حکم ہوا تو اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود قلم آمادہ تحریر ہو گیا۔ کیوں نہ ہوتا، یہ صدا تو خاک وطن کی طرف سے آئی ہے۔ اگرچہ اب تو بہت وقت گزر گیا لیکن ایک عشرہ پہلے کے وہ دن مجھے شدت سے یاد آرہے ہیں جب میں براستہ واہگہ عازم کشمیر ہوا تھا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے

ہم کون شناور تھے کہ یوں پار اُترتے
سوکھے ہوئے ہونٹوں کی دعا لے گئی ہم کو

راقم نے اُن خوش آثار لمحوں کی ایک روداد ''وادی گل پوش میں'' کے عنوان سے قلم بند کی تو اس پر جناب بونیاری نے خوبصورت پیش لفظ لکھا یہ ۲۰۰۹ء کا واقعہ ہے۔ تب سے اب تک نذر صاحب سے محبت کا ایک تعلق قائم ہے۔

نذر بونیاری اردو اور پہاڑی کے کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ اردو میں اُن کے افسانوں اور کہانیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، ان کی تحریر شستہ، رواں، بامقصد اور اپنی تہذیب اور روایت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کشمیر اُن کی پہلی اور شائد آخری محبت ہے لیکن اس محبت میں پیر پنجال کے پہاڑی سلسلے کا حصہ غائب

ہے۔ نذر بونیاری نے فرض کفایہ ادا کرتے ہوئے کشمیر کی تہذیب، ثقافت، پہاڑی زبان وادب کی تاریخ اور پہاڑی لوگوں کے کچلے ہوئے جذبات اور احساسات و زبان دے کر کشمیر کی آنے والی نسلوں کو ایک پہچان عطا کر دی ہے۔

ستر برسوں سے ہی نہیں گزشتہ کئی صدیوں سے کشمیری قوم تاریخ کے چرخاب میں پھنسی، بے یقینی اور انتشار فکر کا شکار ہے۔ کشمیریوں کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں اپنی بقاء اور سالمیت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ معاملہ اس قدر حساس اور نازک ہے کہ اکثر اوقات سانس لینے بھی احتیاط کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ کیفیت یہ ہے

وہی سچ ہے جو آنکھوں سے ہویدا ہوتا رہتا ہے
اگر ہونٹوں سے پوچھو گے تو انکار کر دیں گے

حالات کے جبر کے باعث کشمیر کی پرانی کیا نئی نسل بھی اس فن سے اب بخوبی آشنا ہے کہ کون سی بات کہنی ہے اور کون سی چھپانی ہے۔

زیر نظر کتاب ''دل نامہ'' نذر بونیاری کے تحریر کردہ ''انشائیوں'' کا ایک مجموعہ ہے۔ جہاں تک ''انشائیہ'' کا تعلق ہے یہ صنف نثری ادب کا ایک خاص اسلوب ہے۔ یہ اپنے موضوع اور ہیت کے بموجب ایک مخصوص صنفی مقام کا مستحق ہے۔ اُردو ادب نثری اصناف مثلاً قصہ' داستان' حکایت' ناول' ڈرامہ' افسانہ' تمثیلیہ' خاکہ' روئداد' رپوتاژ' مراسلہ' مقالہ' زواریہ' روزنامچہ' سوانحی مقالہ' فکاہیہ اور ایسی اصناف نثر جنہیں فی الوقت کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ انشائیہ بجائے خود مضمون کی ایک قسم ہے جو اُفق پر قلم کار کے مزاج و مذاق کی افتاد اور نظر و فکر کی پرواز کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انشائیہ کے اُفق پر قلم کار کی وہی صلاحیتیں حسن قوس قزح کی طرح نمودار ہوتی ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں پاکستان میں اس صنف پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہندوستان کے ایک برگزیدہ ادیب اور مقبول مصنف حسنین ''انشائیہ اور انشائیے'' میں رقم طراز ہیں کہ سرزمین پاکستان میں ''ادبیات انشائیہ'' کا جو تنقیدی اور تخلیقی سرمایہ منظر عام پر آیا ہے۔

میں نے سارے انشائیے دلچسپی سے پڑھے۔ یہ کہنا بہت مُشکل ہے کہ اِن میں سے کون کون سا انشائیہ مجھے اچھا لگا۔ تاہم ''چھینک''، ''مکھی''، ''افراتفری''، ''ماں''، ''ہاتھ'' وغیرہ ایسی تخلیقات ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو من کرتا ہے۔ انشائیہ لِکھنا کوئی سہل کام نہیں۔ اسے ''ادب لطیفے'' کے کھاتے میں اس لئے شمار نہیں کیا جاتا ہے کہ انشائیہ محض ذاتی تاثر ہے۔ محض انشائیہ پردازی کا طلسم یا رنگین اور فکر انگیز ادبی تخلیق بلکہ یہ نثری ادب ایک حساس اور توانا صنف ہے۔ انشائیہ ایک نثری غزل ہے۔ انشائیہ کی داخلیت صرف دل ہی کو نہیں چھیڑتی یہ دماغ کو بھی قلابازیاں دکھلاتی ہے۔ Hudson انشائیہ کو ذاتی نوعیت کی تحریر قرار دیتا ہے۔

اِس سے پہلے میں نے نذر بونیاری کے افسانوں کے دو مجموعے ''بانجھ ماں کا بیٹا'' اور ''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں'' بھی پڑھے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دوسرا آدم'' کہیں ۱۹۷۱ء میں چھپا ہے۔ اُسکی کوئی کاپی آج دستیاب نہیں۔ نہ نذر بونیاری کے پاس نہ کسے کُتب خانے میں۔

بہر حال جو کچھ بھی اُن کے قلب وقلم سے نکل کر صفحات قرطاس پر بکھرا ہوا ہے اُس کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ نذر بونیاری تحسین وتبریک کے سزاوار ہیں کہ گزشتہ کئی عشروں سے نئی نسل کو تخلیقی نثر کے ذریعے مٹی پر چلنے کا سلیقہ سِکھا رہے ہیں اور ایک اور قدم بڑھ کر اُنہوں نے اِس دلچسپ صِنفِ ادب

(انشائیہ نگاری) کے میدان میں بھی اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ نذر بونیاری کی موجودہ کاوش ہمارے لئے ایک سنگِ نشان کے طور پر موجود رہے گی جس کی لو سے ہم اپنا سفر منزل کی طرف جاری رکھ سکیں گے۔ میں اُن کو اِس کاوش پر دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔

پروفیسر ظفر حسین ظفرؔ
شعبہ اُردو؛ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد۔ (پاکستان)

مقدمہ

راجہ نذرؔ بونیاری کا نام ریاست کے ادبی نقشے پر اگرچہ ۱۹۶۳ء سے نظر آرہا ہے، لیکن انہوں نے اپنے افسانوی سفر کی شروعات ۱۹۶۴ء سے کی، جب اُن کا پہلا تحریر کردہ افسانہ ماہنامہ ''پرواز'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے شائع ہوئے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کے افسانوی سفر کا باقاعدگی سے آغاز ۱۹۶۷ء میں ہوا جب اُن کا افسانہ ''کلائمکس'' کے عنوان سے ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوا۔ اُس زمانے میں بھی بیسویں صدی ادبی اُفق پر چھایا ہوا تھا اور اس میں شائع ہونا آسان نہ تھا لیکن یہاں یہ کہنا مناسب رہے گا کہ ریاست جموں وکشمیر کے اکثر افسانہ نگاروں کے افسانوں کو ''بیسویں صدی'' میں شائع ہونے کی وجہ سے پہچان مِلی۔ اب تک نذرؔ بونیاری کے کئی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں اور دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اُن کے افسانوں کے تعلق سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں اپنے آس پاس کے لوگوں کے مسائل اور مُشکلات اِس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ فوراً ہی اُن کی فِکری بالیدگی اور بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بُنیادی طور پر ایک حساس کہانی کار ہیں اور یہ اُن کی افسانوی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے جو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

راجہ نذر بونیاری کی ادبی زندگی کا ایک اور بھی روپ ہے، وہ ایک صحافی بھی ہیں۔ ایک کالم نویس کی حیثیت میں اُن کے کالم اخباروں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ وہ کئی مقامی اخباروں سے منسلک ہیں۔

اب اُن کی ادبی زندگی کا ایک اور روپ سامنے آرہا ہے۔ اُن کی تازہ ترین تخلیق اُن کے شائع کردہ انشائیوں پر مشتمل ہے اور یہ مجموعہ "دل نامہ" کے عنوان سے آپ پڑھ سکتے ہیں۔ اِن انشائیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں تخلیق کار نے اپنے جذبات و احساسات، اپنی تڑپ اور شدتِ احساس کو لفظی پیرہن عطا کیا ہے۔ زبان سلیس، رواں دواں اور صاف سُتھری ہے۔ موضوع اور مواد اہمیت کے حامل ہیں۔ جب تخلیق کار کے ذہن میں پوشیدہ الفاظ دل کے لہو کی روشنائی سے قلم کے راستے کاغذ پر نمودار ہوتے ہیں تو اُن کے پڑھنے والوں کو اپنے ہر سمت پھیلی ہوئی تاریکی میں روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ یہ انشائیے پڑھ کر اگر آپ کو بھی روشنی کی وہ کرن نظر آتی ہے تو میں سمجھوں گا کہ راجہ نذر بونیاری اپنی بات کہنے میں کامیاب رہے ہیں۔

نور شاہ

سرینگر

۲۷ رجنوری ۲۰۱۹ء

دیباچہ

عام طور پر دستور ہے کہ مصنف یا مولف یا مترجم اپنی کتاب کی پیش کش کے بارے میں ایک دو صفحہ شروع میں لکھتا ہے اور اُسے ''مقدمہ'' کی سرخی سے نوازتا ہے۔ میں نے بھی چاہا کہ پہلے ''مقدمہ'' پیش کردوں، لیکن مجھے کورٹ کچہری سے اس قدر وحشت ہوتی ہے کہ پیشی سے پہلے خود اپنے حق میں نمازِ وحشت پڑھنے لگتا ہوں، اس لئے ''مقدمہ'' کا عنوان قائم کرنا میرے بس کی بات ہی نہ تھی۔

پھر خیال آیا کہ ''پیش لفظ'' کو عنوان بناؤں۔ مگر جب بھی لکھنے بیٹھا تو ذہن میں ایک کھٹک سی پیدا ہوئی کہ میں پوری ایک کتاب پیش کر رہا ہوں، پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے لئے پیش لفظ لکھوں۔ اس سے تو بہتر ''پیش کتاب'' لکھنا ہوگا۔ لیکن اس عنوان سے تو صرف یہ ظاہر ہوگا کہ یہ کتاب ہے، رسالہ یا اخبار نہیں، مراسلہ یا فرمان نہیں۔ مگر کتاب کے اندر کیا ہے؟ کیوں لکھی گئی؟ موضوع کیا ہے؟ غرض پچاسوں باتیں ذہن میں آتی ہیں اور ''پیش کتاب'' کی ترکیب پر پانی پھر جاتا ہے۔

بڑی پریشانی میں مبتلا رہا کہ آخر سرخی کیا قائم کروں؟ آخر اپنی بے بسی پر ترس کھاتے ہوئے یہ سوچا کہ کتاب میں نے لکھی ہے، اس کا تعارف کسی بڑے صاحب قلم سے لکھوالوں۔ لیکن میں کبھی اس بات کا قائل نہیں کہ حلوائی کی دکان پر دادا کی

فاتحہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک میں نے اپنی کسی کتاب پر کسی سے بھی کوئی مقدمہ یا پیش لفظ یا تقریظ نہیں لکھوائی اور ہمیشہ ''خودکوزہ، خودکوزہ گر، وخود، گلِ کوزہ'' پر سختی سے گامزن رہا۔

اسی اُدھیڑ پن میں دن ہفتوں میں بدلے اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلنے والے ہی تھے کہ موت کی گھڑی کے الارم کی آواز کانوں میں آئی۔ پھر نہ پوچھیے، دوڑ تو دوڑ، کیا کروں کیا نہ کروں۔ پسماندہ رقم بھی نہیں، طوطے کی طرح کھایا اور کھا کر کٹوری اُلٹ دی۔ مقدمہ اور پیش لفظ کہاں سوجھتا.........۔

یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ ایک ہی مزاج کی چیزیں ایک کتاب میں ہو جائیں بلکہ جو بھی سامنے نظر آیا اُسے یکجا کر لیا۔ اس طرح یہ کتاب معجونِ مرکّب بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ البتہ پڑھ کر اپنی رائے لکھ کر اس پتہ پر روانہ کریں۔

''دل نامہ'' کے بارے میں اپنے اُستاد اُردو کے برگزیدہ اور نامور افسانہ نگار جناب نور شاہ صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ''دل نامہ'' پر اپنے قیمتی تاثرات کا اظہار فرمایا۔ میں اپنے ایک محسن اور دوست اُردو کے محقق، ادیب اور صحافی پروفیسر ظفر حسین ظفؔر کا سپاس گزار ہوں، جنہوں نے میری اِس حقیر سی کاوش پر اپنی گرانقدر رائے سے سرفراز فرمایا۔ میں اپنے رفیق جناب عبدالخالق پرویز اور عزیز دوست عبدالواحد منہاس کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے ''دل نامہ'' کی کمپوزنگ اور دیگر معاملات کے سلسلے میں مجھے اپنے تعاون اور مشوروں سے نوازا۔

راجہ نذؔر بونیاری

خواب نامہ

خواب کئی طرح کے ہوتے ہیں ۔سہانے خواب، ڈراونے خواب، رنجیدہ خواب، سنجیدہ خواب، طویل مدتی خواب، قلیل مدتی خواب، بھیانک خواب، نحس خواب، سعد خواب ، مبارک خواب، رنگین خواب، سنگین خواب، خوابِ سحر، خوابِ نیم شب، خوابِ پریشان، نادیدہ خواب، خوابِ نامکمل یعنی ادھورے خواب، خوابِ غفلت، خوابِ خرگوش ، ہلکے پھلکے خواب، گہرے خواب، بانجھ خواب، سچے خواب.........
خواب ہی دنیا میں ایک ایسی واحد شئی ہے، جسے آنکھیں بند کر کے بھی ''دیکھا'' جا سکتا ہے۔ جب کوئی محوِ خواب ہو تو ضروری نہیں کہ وہ کچھ دیکھ بھی رہا ہو، بلکہ خواب نیند کو بھی کہتے ہیں۔ میں نے اپنے کئی دوستوں سے یہ سوال کیا کہ جب آنکھیں بند ہوں اوپر سے صاحبِ خواب بے ہوش یا بے سدھ ہو تو وہ کیسے کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔؟ ایک دوست مجھے اپنے ایک پروفیسر دوست کے پاس لے گیا، جو یونیورسٹی میں ''نفسیات:: پڑھاتے ہیں ۔فاضل پروفیسر نے اس موضوع پر کم سے کم اڑھائی گھنٹے فلسفہ بکھار دیا۔اور ڈریم، سومنلزم، مسمرازم، اور ہپناٹزم جیسے غیر مطلوبہ موضوعات پر اپنا سارا علم

کھنگال ڈالا۔ لیکن اصل موضوع پھر وہیں کا وہیں رہا کہ آنکھیں بند کر کے یا پھر مست نیند میں ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اُس رات نہ مجھے نیند آئی، نہ میں نے کوئی خواب دیکھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ساٹھ ستر سال پہلے دنیا میں کسی بھی جگہ صرف بلیک اینڈ وائٹ فلمیں بنتی تھیں اور کیمرے میں جو فلم ڈالی جاتی تھی وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو ہی بناتی تھی، لیکن ''خواب''، تخلیق آدم کے وقت سے ہی بلیک اینڈ وائٹ، ٹیکنی کلر یا پھر کلرڈ دیکھے جاتے تھے یعنی چیز کو اُس کے اصل رنگ میں دیکھا جاتا تھا۔

خواب دیکھنے کے بعد جب صاحب یا صاحبِ خواب کی بھاری پلکوں کے دروازے وا ہوتے ہیں تو اندر کچھ نہیں ہوتا، وہ یہ بتانے سے قاصر ہوتا ہے کہ اُس نے جو خواب دیکھا، وہ بلیک اینڈ وائٹ تھا، یا کلرڈ (رنگین) پھر وہ Recollect کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا۔ ذرا آپ بھی یاد کرنے کی کوشش کیجیے کہ گزشتہ شب آپ نے جو خواب دیکھا تھا، اُس میں کیا دیکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو چیز ہم دن کو جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہی چیز رات کو دورانِ خواب دیکھتے ہیں، کیونکہ اس کا عکس لاشعور کے تہہ خانے میں جا کر سٹور ہو جاتا ہے۔

آج کل جو چیزیں ہم آئے دن کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہم سو جاتے ہیں تو یہی چیزیں ہمارے ذہن کے پردے پر آکر متحرک ہو جاتی ہیں۔ تو بتائیے پھر آپ نے جو لہو کا ساگر دیکھا، اُس کا رنگ کیسا تھا۔ آسمان کا رنگ کیسا تھا۔ دودھ کا رنگ کیسا تھا؟ جس محبوبہ کے ساتھ آپ ایکو پارک میں بیٹھے پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے، اُس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا؟۔ خود محبوبہ گوری تھی یا چٹی یا پھر سیاہ فام۔ اس کے ہونٹ گلابی تھے یا عنابی، اس کی نیم وا آنکھیں شرابی تھیں یا......؟ اس کے گیسوئے خمدار سیاہ تھے یا بھورے وغیرہ وغیرہ ذرا یاد کیجیے۔

اپنے ایک فاصل دوست جسے دور کی سوجھتی ہے، جب میں نے اپنی تحقیق کے ایک حصے کے طور پر یہ سوال پوچھا کہ کیا اندھا بھی خواب دیکھ سکتا ہوگا۔ کیا اس کی ایک حس Visual Sensation کی عدمِ موجودگی میں اس کے دیگر چار حواس پر کوئی فرق پڑتا ہوگا تو ہمارے دوست نے اس سوال کا جواب تو نہیں دیا البتہ اتنا ضرور کہا کہ ''بہتر ہے یہ سوال آپ اندھے سے ہی پوچھیں۔ جب اسی سوال کو ذرا (الفاظ کو آگے پیچھے کر کے) ایک پیدائشی نابینا کے سامنے دہرایا (دوسرے معنوں میں اس سے پوچھنے کی جسارت کی) تو اس نے ایک مختصر سے فقرے میں اس کا جواب دیا ''ہاں.......میں خواب دیکھتا ہوں..........'' پھر کچھ دیر توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا ''لیکن ہم جیسوں کے خواب اور آپ کے خواب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ میں دو طرح کے خواب دیکھتا ہوں، ایک وہ خواب جو دورانِ نیند دیکھا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو میرے جیسے لوگ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں صورتوں میں میری آنکھوں کا اس میں کوئی رول نہیں ہوتا۔ اس اندھے دوست کے جواب سے مجھے اپنے پہلے سوال کا جواب مل گیا، جو میں نے نفسیات کے پروفیسر سے پوچھا تھا۔ میرے پہلے کے سوال کا جواب مجھے یہ ملا کہ ''خواب آنکھوں سے نہیں دیکھا جاتا''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی اور بھی خفیہ آلہ ہمارے وجود کے اندر موجود رہتا ہے، جو وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے، جو ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔

اندھے دوست سے میرا اگلا سوال یہ تھا کہ ''کیا اندھا رنگین (Coloured) خواب دیکھ سکتا ہے؟ اُس نے کہا ''ہاں'' اس کے جواب نے میری پریشانی میں اضافہ کر دیا اور اس پریشانی کی کوکھ سے میرے اگلے سوال نے جنم لیا'' کیا آپ کو رنگوں کا تصور ہے؟'' اس مافوق الفطرت انسان نما اندھے نے کہا ''ہاں''۔ میں نے

جھٹ اگلا سوال داغ دیا۔ ''اگر آپ نے کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں، تو پھر اس چیز کی ساخت، نقشے اور رنگوں کا تصور آپ کے پاس کیسے آ گیا؟''

اگر یہی سوال میں نے سائیکولوجی کے ایچ، او، ڈی سے کیا ہوتا تو وہ اس سوال کا جواب دو گھنٹے میں بھی نہ دے پاتا اور اُلٹا دماغ چاٹ جاتا، لیکن میرے اندھے دوست نے صرف ایک ہی جملے میں جواب دے دیا۔ ''میں نے آپ کو کہا کہ آنکھوں کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دل کی آنکھوں سے......''

''پھر بتایئے کہ آسمان کا رنگ کیسا ہے''؟ میں نے سوچا شاید اندھا اُلٹا مجھ سے ہی پوچھے گا۔ ''پھر بتایئے کہ آسمان کیا ہوتا ہے'' لیکن اُس نے میری شرٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''ایسا...... یاد رہے کہ میری شرٹ کا رنگ نیلا تھا۔ ''خون کا رنگ کیسا ہوتا ہے'' ''بوڑھی مرچ جیسا'' ''اور دودھ کا؟'' ''برف جیسا......'' اس سے پہلے کہ میں پاگل ہو جاتا، میں نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔...... چلتے چلتے کئی قسم کے خیالات میرے ذہن کے ناقص پردے پر ابھرنے لگے۔ ''آخر ان آنکھوں کا پھر کیا فائدہ؟ جب ہم آنکھیں بند کر کے یا آنکھوں کے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں...... خواب میں نہ جانے کیا کیا دیکھ سکتے ہیں...... وہ سب کچھ بھی دیکھ سکتے ہیں، جو ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، جب ایک اندھا بھی خواب دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی ملٹی کلر...... تو......(میں نے اپنی آنکھوں کو چھو کر دیکھا اور رُک کر ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں یہ اپنی توہین اور بے عزتی برداشت نہ کرتے ہوئے ''روٹھ'' نہ گئی ہوں) لیکن اُس وقت مجھے سب کچھ نظر آیا تو اُس ربِّ کریم کا شکریہ ادا کیا، جس نے ہمیں اس نعمت سے نوازا ہے۔

ذکر خواب کا چل رہا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ خواب بنا آنکھوں کے بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور جاگتے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس دنیا میں

زیادہ خواب جاگتے ہوئے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں .... ہاں یہ سچ ہے۔میں اور مجھ جیسے انگنت آنکھوں والے جاگتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں .... وہ خواب جن کی تعبیر کوئی نہیں بتا سکتا...... یا پھر ایسے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہی نہیں .... یا پھر ایسے خواب جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے .... اور ایسے خواب جنہیں ہم نے شرمندۂ تکمیل ہوتے دیکھا ہے......

(مثال کے طور پر قاضی گنڈ سے بارہمولہ تک ریلوے لائن ایک ایسے ہی خواب کی تعبیر ہے)۔ایسے خواب جو صرف نادان، احمق، کم ہمت، شکست خوردہ، مایوس اور سادہ لوگ دیکھتے ہیں، جب ان کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، وہ محوِ خواب ہوتے ہیں۔ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے اُن کے سپنے ہوتے ہیں، ارمان ہوتے ہیں آرزوئیں تمنائیں اور خواہشات ہوتی ہیں۔وہ محوِ خواب ہوتے ہیں اور جب وہ پلک جھپکتے ہیں تو یہ خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں:

ریزہ ریزہ شب، پارہ پارہ خواب

اور اپنی جاگتی آنکھوں کے سپنوں کا حشر دیکھ کر وہ ان کی کرچیاں اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں چبھتی ہوئی محسوس کرتے ہیں اور اُسوقت اُن کی خشک مری ہوئی آنکھوں سے ساون بھادون کی جھڑی لگ جاتی ہے، جن میں پانی کے بجائے لہو ٹپکتا ہے۔یا وہ پچھلے موسم کا سوکھا تالاب لگتی ہیں، جس میں ناکام حسرتوں کی خشک بطخیں نہار ہی ہوں۔یہ حسرت ناک خواب اور اس کے حسرت ناک انجام (تعبیر) کو ہم اُن آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، جو خواب نہیں دیکھ سکتیں........ مردہ........ پتھرا گئیں آنکھیں...... ایک سیانے کا قول ہے کہ دنیا میں ۹۹ فی صد چشم بینا رکھنے والے لوگ مرتے ہیں تو اپنے خوابوں کو آنسوؤں کا کفن اوڑھ کر پلکوں کے اندر ایک گہری تاریک اور تنگ قبر میں سُلا دیتے ہیں۔

خوابوں کی دنیا کے باسی جو خوابوں کے سہارے جیتے ہیں، وہ بیک وقت جاگ بھی رہے ہوتے ہیں، سو بھی رہے ہوتے ہیں اور زندہ بھی ہوتے ہیں۔ خواب جو صرف زندہ لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں، خواہ وہ جاگ رہے ہوں یا سو رہے ہوں، ان کی کھلی آنکھیں کھلی ہوں یا بند......وہ خواب، خوابِ پریشان ہوں یا سہانے سپنے، طویل ہوں یا مختصر........رنگین ہوں یا سادہ خواب، نیم شب کے ہوں......خوابِ نادیدہ ہوں یا سراب ہوں......ان کا انحصار اہلِ خواب پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جتنی آنکھیں اتنے خواب........نسلِ آدم سے تعلق رکھنے والے ہر ذی روح فرد کے خواب الگ الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جیسے بے شمار خواہشیں رکھنے والا شخص، جس کا ہر خواہش کے بعد دم نکلتا ہے اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر میں بے خواب آنکھوں میں بے کفن لاش کو آنسوؤں کے تالاب میں تلاش کرتے ہیں۔

مگر بدبو میں لپٹی بانجھ دن کی لاش کو
پہلو میں لے کے سونے والے خواب کیا دیکھیں

ارمان پھر بھی باقی ہوتے ہیں اہلِ خواب کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے خواب دیکھنے کا.....بادشاہ، حکمران، عالم، تاجر، دانشور، سیاستدان، کسان، محنت کش، مزدور، بھکاری، اندھا، چور، رہزن، مرد، عورت اور بچہ.........سب خواب دیکھتے ہیں۔ ایک مزدور یا محنت کش دن بھر تکان کما کر لاتا ہے۔ اور اس تکان کو بچھا کر اور پھر خواب اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ بھوکے کا خوب ایک روٹی ہوتا ہے۔ جیسے چکور کا خواب چاند، شاعر کا خواب اس کے زرخیز اور تخلیقی ذہن سے اُگنے والے پھولوں کی خوشبو جیسا ہوتا ہے۔ ایک مظلوم اور محکوم انسان کا لہولہان خواب اُس کی مجبوری اور بے کسی کی داستان کا عنوان ہوتا ہے۔ دانشور کا خواب کسی مقدس صحیفے کی عبارت جیسا ہوتا ہے۔ جیسے حضرت انسان

''دیکھنے'' کا تہمت بردار ہوتا ہے۔ اسی طرح حیوان اور پرندے بھی اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مشہور محاورہ ہے کہ ''بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے نظر آتے ہیں''۔

ایک معصوم بچہ جب دورانِ خواب مسکراتا ہے تو فرشتوں کو بھی رشک آتا ہے۔ بھلا وہ خواب میں دیکھتا کیا ہے۔ اس کا خواب اس کی ماں ہوتی ہے۔ وہ ماں کی گود میں ہو یا پالنے میں یا کہیں اور جب 'لوری' کی میٹھی آواز اس کی معصوم اور نازک سماعت میں ڈوب جاتی ہے تو ماں کی گرماہٹ سے اُس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی جاتی ہیں اور وہ خود بوڑھی ماں کا ''خواب بن جاتا ہے''۔ جواں سال بیٹی کی بوڑھی ماں کا خواب........ جوان سال بیوہ بہو کی بوڑھی ساس کا خواب....... اَن جنی نسل کے سارے خواب میری کوکھ میں ہیں۔

گویا بے ورق، بے لفظ، بے تحریر صدیوں کا عذاب میری آنکھوں سے کوئی دیکھے، سراب........ راستوں میں ریزہ ریزہ بے نشان جسموں کے خواب........ جب خواب کی ساری کتابیں بے ورق ہو جاتی ہیں........... تب ریزہ ریزہ شب کے سارے خواب سو جاتے ہیں پارہ پارہ' خواب جو آنکھوں سے منسوب ہوتے ہیں .... ہر خواب کسی نہ کسی حقیقت کا آئینہ ہوتا ہے...... ''یہ کسی ماہر نفسیات عالم کا خیال ہے...... لیکن شروع رات کا خواب محض خواب ہوتا ہے، جب کہ نیم شب کے خواب کی تعبیر کافی دیر کے بعد نکلتی ہے اور خوابِ سحر ٹوٹتے یا کھلتے ہی پورا ہوتا ہے...... واللہ اعلم!

نہ سہہ سکا جب مسافتوں کے عذاب سارے
تو کر گئے کوچ میری آنکھوں سے خواب سارے

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ سے اُس کے خادم پہرے دار نے کہا'' بادشاہ سلامت مبارک ہو! میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کو چاند سا شہزادہ ہوتا ہے۔ خادم یہ سمجھ رہا تھا

کہ بادشاہ یہ سن کر اسے انعام واکرام سے نوازے گا، لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ پہرے دار کو پھانسی پر لٹکا یا جائے۔ یادر ہے کہ بادشاہ کو سات ملکاؤں میں سے کوئی اولاد نہ تھی۔ خادم حیران ہوا کہ بھلا اس سے کیا قصور ہوا! اُس نے ایک خوش خبری کے بدلے سزائے موت کا سبب دریافت کیا تو بادشاہ نے کہا " تمہارا کام رات کو جاگتے رہنا ہے، نہ کہ سونا، اور خواب تو سونے کے بعد آتا ہے۔ تم نے فرض میں کوتاہی کی ہے۔ اس لئے پہلے تجھے سزا ملے گی پھر انعام......"

خواب ایرا غیرا نتھو خیرا...... بلالحاظ،، مذہب وملت رنگ ونسل، ذات وجماعت، جنس ومعیار دیکھ سکتا ہے۔ اس کے لئے جاگنا یا سونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اہلِ دانش کا خیال ہے کہ سب سے زیادہ خواب خاک نشین اور فقراء دیکھتے ہیں۔ ننگی زمین پر خالی پیٹ، خالی جیب گہری نیند آتی ہے۔ شہنشاہ اور حکمران بہت کم خواب دیکھتے ہیں، کیونکہ اُنہیں دبیز گدوں، ریشمی بچھونوں پر انہیں نیند نہیں آتی۔

القصہ خواب ایک بن بلائے مہمان کی طرح جب چاہئے آجاتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں روک سکتا محل کا بند دروازہ، نہ جھونپڑی کی کچی دیوار، نہ پہرے دار کی بندوق، نہ حکمران کا قہر نہ شام وسحر۔

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگرؔ
زندگی ہے خواب، اجل تعبیر خواب

افرا بنامِ تفری

افرا اور تفری کی تاریخِ پیدائش ایک ہی ہے۔ وجودِ عالم اور ظہورِ آدم سے لے کر اس دم تک دونوں ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ اغلب ہے کہ تا قیامت ایک ساتھ ہی رہ کر دنیا اور دنیا والوں کی چھاتیوں پر مونگ دَلتے رہیں گے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ افرا اور تفری دونوں جُڑواں ہیں۔

''افرا'' مذکر ہے اور ''تفری'' مونث .... افرا اور تفری کو الگ الگ کر کے پڑھا جائے تو یہ دو الگ الگ الفاظ جو روزمرہ کا مرکب اسمِ صفت ہے......... دوسرے دو لفظی مرکب الفاظ کی طرح اس قبیل سے تعلق رکھنے والے اور کچھ الفاظ جو روزمرہ کی بول چال میں مستعمل ہیں .... مثلاً ہیرا پھیری، نفسا نفسی، مارا ماری، ہاتھا پائی، کھینچا تانی .... چونٹا چانٹی، اُتھل پتھل، اناپ شناپ اور بھاگم بھاگ وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے اگر ایک کا سابقہ یا لاحقہ ہٹا دیا جائے تو .... یہ لفظ اکیلا رہ جاتا

ہے اور بے معنی اور مہمل بھی، جس کی افادیت لسانی دُنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان الفاظ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپسی اتحاد، اتفاق اور یک جہتی کے لئے ان کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اگر یہ اتحاد اور اتفاق ٹوٹ جائے تو دونوں مرجائیں گے۔ یعنی دوسرے معنوں میں یہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

جہاں تک افراتفری جیسے ذو جس لفظ کی قومیت کا سوال ہے، تو یہ طے ہے کہ یہ لفظ خالص ہندوستانی ہے۔ ہندوستان میں اس کے معنی جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ یہ دو مہمل الفاظ یعنی ''افرا'' اور ''تفری'' آپس میں نہ میاں بیوی کا رشتہ رکھتے ہیں، نہ بھائی بہن کا.......لیکن کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رکھتے ہیں...... بولنے اور سمجھنے میں آسان ہونے کی بدولت یہ عام اور روزمرہ کے استعمال میں آنے والا لفظ ہے، جو نہ صرف پڑھا لکھا شخص بول سکتا ہے، بلکہ ناخواندہ بھی ......اس لفظ کو ہندوستانی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو، ہندی، شمال، مغرب اور مدھیہ بھارت (وسطی ہند) کی ساری زبانوں میں باآسانی سمجھا اور بولا جاتا ہے اور ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے چاروں صوبوں میں زبان زدِ خاص و عام ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ معنوی اعتبار سے ناپسندیدہ لفظ ہماری مشترکہ لسانی اور سماجی، تہذیبی زندگی کی میراث ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے سیاسی ماحول میں ''افراتفری'' کا ایک لازمی رول رہا ہے۔ شب و روز (چوبیس گھنٹے) یہ ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے یعنی جزو لاینفک..........

عملی طور پر ساری دنیا.......ظہورِ آدم کے وقت سے ہی اس مخلوط جوڑی کا شکار رہی ہے۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ.......اس کے بعد ہونے والے فتنے، تنازعے، جنگھیں، خون ریزی، باہمی جھگڑے اسی جوڑی سے جنے اور افراتفری نام کی ہوا سے

ان کی نشو و نما اور ترقی ہوئی، جس میں دنیا ختم ہوگئی، لیکن افرا تفری زندہ اور باقی رہی۔ اس منفی معنی والی اصطلاح میں سے نہ آدھا لفظ یعنی سابقہ یا لاحقہ کو حذف کر دیا جائے تو دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے، کیونکہ اس اصطلاح کا اثر جاتا رہے گا۔ کیونکہ نہ افرا سے امن تباہ ہوسکتا ہے نہ تفری سے، اسی لئے سیانوں کا قول ہے کہ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں اور یہ کہ اتفاق میں طاقت ہے۔ معمولی کمزوری سے دو حروف کو جوڑا جائے تو.....................!

چین

''چین''......... پتہ نہیں کہ تین حروف کا یہ خوبصورت لفظ مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ جب کبھی بھی یہ لفظ سنتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے میرے کان کے نزدیک سارنگی کی مہین تاروں سے چھیڑا ہو۔ اپنے محترم اُستادوں، علمائے کرام اور مولوی صاحبان کی زبانی سینکڑوں مرتبہ سنا اور کتابوں میں بھی پڑھا ''اُطلبو العلم ولو کان بالسین'' ''علم حاصل کرو.......اس کے لئے اگر تمہیں چین بھی جانا پڑے''۔ علم کے حوالے سے بھی اس قول کو بار بار سن کر دل میں چین کے لئے عقیدت اور احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں .... میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر دیوار میں ایک چھوٹے سے سوراخ میں ....ایک چڑیا رہتی تھی.......... ہر سال مئی کے مہینے میں وہ اس آشیانے میں انڈے دیتی تھیں اور تین ہفتوں کے بعد کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے ایک آواز گزر کر میرے کانوں میں رس گھولتی تھی.......... ''چیں چیں''۔ یہ اس چڑیا کے ننھے ننھے بچوں کی آواز ہوتی، جن سے میرے کان اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ جس دن یہ آوازیں میں نہ سنتا، عجیب بے قراری سی بڑھ جاتی ۔ یوں بھی ایسے سینکڑوں پرندے ہیں، جن کی زبان چینی زبان کے مختلف Dialect Shade لگتی ہیں، جن

کی بولیاں لسانیات کے ماہرین پتہ نہیں اس موضوع پر کیوں خاموش ہیں۔ ایامِ بچپن خصوصاً طالب علمی کے زمانے میں جب ہم ''نوشتۂ دیوار پڑھنے کے لائق ہوئے، تو میں نے سکول کی ایک دیوار پر کچھ اس قسم کی.... معلومات...... پینٹ کی ہوئی دیکھیں ''دنیا کا سب سے بڑا برِ اعظم...... ''ایشیاء'' ....، دنیا کی سب سے اونچی عمارت........ نیو یارک میں، دنیا کا سب سے لمبا دریا.......... دریائے فرات....، دنیا کا آبادی کے لحاظ سب سے بڑا ملک ...... ''چین'' ہے۔ دنیا کا چھٹا عجوبہ...... دیوارِ چین........ دنیا کا آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر سنگھائی (چین میں) وغیرہ وغیرہ...... چین یوں بھی کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے ہر گھر میں موجود رہتا ہے۔ رسوئی گھر میں جو پلیٹیں اور چائے دانی رکھی رہتی ہے وہ بھی ''چینی'' کہلاتی ہے.... خواہ وہ کہیں بھی بنی ہو، لیکن اس Metel) کو چائنا یا چینی کہتے ہیں اور جب میری بیوی رسوئی گھر میں ہوتی ہے تو وہاں سے جو آوازیں آتی ہیں، لگتا ہے کہ کوئی چینی بولی بول رہا ہے یا پھر چین ''بھائیوں بہنوں'' کے ناموں کی فہرست پڑھ رہا ہے۔ کھانڈ یعنی ''چینی''، جس شکر پاٹ میں ہے، وہ بھی چینی کی ہے۔

چین کے بارے میں سماجی علوم کی کتابوں میں بے حد اہم معلومات درج ہیں۔ مثلاً علمِ سماجیات اور علمِ العمرانیات کے ماہرین کی تحقیق کے مطابق دنیا کے قدیم ترین انسان چین میں رہتے تھے، جو ہاتھوں اور پیروں سے ایک ساتھ چلتے تھے، جیسے ریچھ یا بندر........ اسی لئے ''چینیوں'' کو دنیا کی قدیم ترین ثقافتی آثار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ قدیم ترین مخلوق ہونے کے باوجود وہ موجودہ دنیا میں جدید ترین ترقی یافتہ اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے جسمانی خدو خال (Anthropolgical Features) اور ناک نقشے کے لحاظ سے وہ جنوبی مشرقی ایشیاء کے دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں۔ اس

کی وجوہات لکھتے ہوئے ایک امریکی سیاح نے اپنے سفرنامے میں ایک رونگٹھے کھڑا کر دینے والا انکشاف کیا ہے۔ مائیکل تھامس نامی اس سیاح نے لکھا ہے کہ چینی دنیا کی واحد قوم ہے ، جو ویج اور نان ویج دونوں ایک ساتھ ہیں ، ہربی ورس (Herbivorous) کارنی ورس (Carnivorous) دونوں ہیں۔

سانپ، بچھو اور ہر زہریلے کیڑے مکوڑے کو بھون کر کھا جاتے ہیں۔ گھاس پھوس اور نباتات تو وہ ہرا ہرا ہی چر جاتے ہیں، حیوان، چرند، پرند، کسی بھی جاندار سے پرہیز نہیں کرتے حتیٰ کہ ''آدمی'' اُن کا من بھاتا کھانا ہے۔ انسانوں کے سری پائے ہر چینی کی من پسند غذا ہے، اسی لئے ان کی عمریں بھی لمبی ہوتی ہیں۔ مائیکل کا کہنا ہے کہ چین کے پڑوسی ممالک کے لوگوں کے خدوخال شاید اسی لئے چینیوں جیسے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسی ممالک میں رہنے والوں کو کھا گئے اور خود اُن ممالک میں رہنے لگے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستانیوں اور روسیوں کے خدوخال بھی ویسے ہی ہوتے ، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان اور روس کے ان علاقوں کے خدوخال بھی چینیوں جیسے ہی ہیں۔، جن کی سرحدیں چین سے ملتی ہیں۔ بہرحال ہوسکتا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا رہا ہو، لیکن اب ایسا نہیں .... کیونکہ اب دنیا کی بہت سی قومیں اور افراد 'آدم خور' ثابت ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے بارہ بنکی والے گدھے کو دیکھ کر ایک چینی سپاہی نے دوسرے چینی سپاہی سے کہا تھا ''چیں چائیں پنگ پیچی پیچی چونگ پائی.....'' جس کا مطلب اردو میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ''یہ گدھا ہندوستانی آدمی سے صحت مند اور مزیدار ہے'' اردو کی بات چلی تو مجھے اردو کا ایک محاورہ یاد آگیا ''چین بہ جبین ہونا'' جس کا مطلب ہے، ناراض ہونا، ماتھے پر شکن آنا، غصہ آنا، کہتے ہیں کہ چین کے لوگ کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے، نہ انہیں غصہ آتا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آیئے چین چلیں .... کیونکہ ابن انشاء بھی

یہی کہتے ہیں کہ "چلنا ہو تو چین کو چلئے............" اس سفر نامے کو کھول کر پڑھئے تو آپ کو چین کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔

آیئے..........اس سفر نامے میں سے چند اقتباس میری زبانی سُنئے۔ "ایک عدالت میں گئے۔ایک خاتون وکیل سے ملاقات ہوئی۔ اُس سے پوچھا" یہ عدالت ہے یا........ یہاں تو ہو کا عالم ہے"۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ چین میں کرائم ہی نہیں ہوتا، اسلئے پولیس اور عدالتوں میں کام ہی نہیں"

"ہم نے پیکنگ کا ہوٹل چھوڑ دیا اور شنگھائی روانہ ہو گئے۔ جب شنگھائی پہنچے اور قیام کی غرض سے ایک ہوٹل میں پہنچے تو کاؤنٹر پر منیجر نے ہمیں ایک اخبار کا پیکٹ دیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سے نائیلون کا ایک باتھ روم سلیپر نکلا، جو ہمارے ایک ساتھی نے پیکنگ کے ہوٹل کے باتھ روم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ یہ پرانا تھا۔ منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا" آپ کی یہ امانت ہمیں پیکنگ کے ہوٹل چی چو سا سے ملی ہے، جہاں آپ یہ بھول آئے تھے........"۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسدؔ

دیانتداری اور امانتداری کی اس "حد" کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ اگر وہاں چلو بھر پانی ہوتا تو ہم ضرور اس میں ڈوب مرتے۔ "ہوشا سانگ" کے ایک ویٹر سے پوچھا" تم کہاں رہتے ہو؟"....... "کمرے میں"...... "اکیلے"......... "اس میں ایک عورت بھی رہتی ہے۔" "کیا تم اور وہ عورت دونوں اس اکیلے کمرے میں رہتے ہو؟" "ہاں" .... "تو پھر........ عشق وشق اور محبت وغیرہ بھی ہوتی ہے" "ہاں ہوتی ہے........" "کیا تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی!"........ "نہیں" "کیا تمہارے ملک میں یہ عیب نہیں مانا جاتا ہے۔" "نہیں" کیا تمہیں اس سے واقعی محبت ہے؟" ہاں

..........کیونکہ وہ میری بیوی ہے''

''ایک چوراہے پر کچھ لوگ جمع تھے اور ہنس رہے تھے۔ وہ ایک امریکن عورت کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا'' کیا معاملہ ہے؟'' وہاں موجود ایک شخص نے کہا ''اس عورت نے جو شرٹ پہن رکھی ہے........ تھوڑا نیچے چھاتی پر چینی زبان میں معلوم ہے کیا لکھا ہے؟...... ''مجھے کیسے معلوم ہوگا..........!'' ....''یہاں گرم گرم دودھ ملتا ہے۔''

ایک ویٹر خاتون نے ہمارے کمرے میں آکر ہم سے پوچھا'' نان ویج میں ....آپ کیا کھانا پسند کرتے ہیں''؟ ہم نے کہا'' بکرے کے کباب یا پھر مُرغا، لیکن وہ بھی حلال.........'' خوبصورت عورت نے کہا۔۔''تو پھر آج بھی ویج ہی کھانا پڑے گا'' ہم میں سے ایک دوست نے پوچھا'' ویسے آج نان ویج میں کیا پکا ہے''؟ خاتون نے چھوٹے چھوٹے دانت دکھاتے کہا''..... چوہوں کی بریانی اور فرائی مینڈک........''۔

چین اور بنگال کا جادو بہت مشہور ہے۔ چینی تو جادوگر نہیں ہوتے، ہاں محنتی ضرور ہوتے ہیں۔ ہزاروں میل لمبے دیوار جادو سے نہیں بنتی۔ ایٹم بم جادو سے نہیں بنتا۔ ایٹمی توانائی جادو نہیں ہوتی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ملک کا دنیا کی ایک بڑی طاقت بن جانا کوئی جادوئی کرشمہ نہیں۔ امریکہ اگر دنیا میں کسی سے خائف ہے تو وہ چین ہے۔ ساری دنیا کی تجارتی منڈیوں میں سب سے سستا مال میڈ ان چینا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں فروخت ہونے والی تسبیحیں، جائے نماز اور نماز کی ٹوپیاں چین میں بنتی ہیں۔ مین پاور میں چین دنیا کا پہلا ملک ہے۔ کسی چینی دانشور، سیاست دان، یا سائنس دان نے کسی خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ جدید چین کے معمار اور محنت کش دانشور ماوزی تنگ نے یہ کہا کہ'' اگر ہمارے

ملک میں کھانے والے ڈیڑھ ارب منہ ہیں تو کمانے والے تین ارب ہاتھ بھی ہیں"۔ نظریہ خاندانی منصوبہ کو مسترد کر دیا۔ چین کی سیاحت کرنے والوں اور چین شناسوں نے چینیوں کے ہاتھوں کو چومنے کی تمنا کی ہے۔ ایک یورپی سیاح نے چین والوں کے ہیلتھ کانشس ہونے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "میں نے شمالی چین میں ایک بوڑھے شخص کو ایک سائن بورڈ کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھا، جو رو رہا تھا۔ میں نے پوچھا "دادا جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟۔ گرینڈ پا نے کہا "مجھے ابا جان نے مارا ہے"...... "ابا جان نے......!" ...... "کیا آپ کے ابا جان ابھی بقیدِ حیات ہیں"؟ اُس نے کہا "جی ہاں وہ تو ابھی جوان ہیں" میں نے پوچھا "......اُن کی عمر کیا ہے......"؟ بڑے میاں نے کہا "دو سو سال" ...... "اور آپ کی......" ...... "ڈیڑھ سو سال" "لیکن آپ کے ابو نے آپ کو کیوں مارا ہے"؟ ...... "کیونکہ میں نے دادا جان کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ چوری کر کے نکال لیا تھا"۔ ......تو کیا آپ کے دادا جان بھی......"!؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنے دادا جان کے ابو......کی کوئی کہانی سناتا، میں وہاں سے ڈر کے مارے بھاگا اور بھاگنے سے پہلے اس بڈھے کھوسٹ کے پیچھے لگے ہوئے سائن بورڈ پر لکھی تحریر کو پڑھ لیا۔

"اس علاقے میں آج تک نہ کوئی بیمار ہوا ہے اور نہ مرا ہے" محکمہ سیاحت

چینیوں کی آنکھیں کرنچی اور پُرکشش ہوتی ہیں۔ چہرے پر ناک نام کی چیز برائے نام ہوتی ہے۔ لیکن یہ ناک نہ کبھی کٹی ہے، نہ کٹے گی۔ کیونکہ کٹنے کا خطرہ ہمیشہ اُس ناک کو ہوتا ہے، جو نہ صرف لمبی 'خطرناک' ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں چینی مردوں کو عورتوں کی طرح داڑھی نہیں آتی تھی، لیکن اب آنے لگی ہے۔ پچاس فیصد چینی داڑھی مونچھ سے محروم ہوتے ہیں اور باقی پچاس فیصد کو چگھی داڑھی اور مونچھ کے نام پر دو تین

بال ہوتے ہیں۔ چائے، کافی اور ریشم سب سے پہلے چین میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن چین کا کوئی مرد عورت اور بچہ نہ تو چائے پیتے ہیں، نہ کافی اور نہ ریشم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ بلکہ ''خواتین'' بھی جین یا موٹے ''زین'' کے کپڑے پہنتی ہیں۔ قد میں اوسط سے بھی کم چینی باسکٹ بال میں ساری دنیا میں اول نمبر کے کھلاڑی تسلیم کیئے گئے ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ چینیوں کا صرف ایک چہرہ ہوتا ہے، وہ ہم جیسے ایشائیوں کی طرح دو چہرے نہیں رکھتے......ایک ظاہر.......دوسرا جیب میں۔ اسی لئے چینی اچھے، سچے اور حق پر در مانے جاتے ہیں۔ چینی کی ترجمانی اقبال کے اس مصرعے سے ہوتی ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

چینی نہ ہپو کریٹ ہیں، نہ اُن کے پاس دوہرا معیار۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں میرے گاؤں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ ''بونیار مندر سے کسی نے میرا جوتا چُرا لیا جو میں نے چین سے لایا تھا۔ وہاں سے آگے مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا'' میں ہیون سانگ سے معذرت خواہ ہوں۔ ابن انشاء کی ٹوٹی پھوٹی پرانی چپل پیکنگ کے ہوٹل کی منیجمنٹ نے کوڑادان میں پھینکنے کے بجائے اُسے واپس بھجوادی۔ لگتا ہے کہ انہوں نے ہیون سانگ کا وہ سفرنامہ پڑھ لیا ہے، جس میں اُس نے بونیار مندر سے جوتا چُرانے کے افسوسناک واقعہ کا ذکر کے میری ناک کاٹ دی ہے۔

دوسرا چین

چین صرف ایک ہے جو ایک ملک کا نام ہے۔ پھر یہ دوسرا چین کہاں سے آ گیا........ ویسے بھی ہر ملک کا ایک ہی نام ہوتا ہے، ماسوائے چند ممالک کے۔ مثال کے طور پر ہندوستان جسے کچھ لوگ بھارت کہتے ہیں، کچھ لوگ انڈیا اور کہیں یہ الہند کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا ایسا ملک برطانیہ ہے جسے کہیں یونائیٹڈ کنگ ڈم لکھا جاتا ہے تو کوئی اسے گریٹ برٹن کہتا ہے۔ جنوبی ایشیاء میں اسے انگلستان کہتے ہیں اور انگریزی میں انگلینڈ۔ چین کا بھی ایک اور نام ہے، جس نام سے اسے اس کے گورے حریف پکارتے ہیں اور وہ ہے چائنا......

میں نے ''چین'' اپنے پہلے انشائیے کا نام رکھ کر صرف اسی چین کے خدوخال اور اس عظیم ملک سے وابستہ کچھ سماجی، نظریاتی، اخلاقی اور سیاسی منظر نامے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جسے میری توقعات کے برعکس بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔

ہم چین کے پرستار نہیں، چین کے طرفدار نہیں اور ہمارا دوسرا انشائیہ ''دوسرا چین'' اس کی عکاسی کرے گا۔

یہ عجیب وامیر ملک ہمارا پڑوسی بھی ہے، لیکن جس ہمالیہ کے بالائی حصے میں وہاں سے جب یہ نیچے کی طرف (نشیب) میں جھانکتا ہوگا تو ہم اس کے آگے 'بونے' نظر آتے ہوں گے۔ واللہ اعلم! ہمارے بچپن اور کم علمی سے ہی ہم اپنے اس پڑوسی کا نام

سنتے تھے تو اس کے ساتھ مختلف ''افسانے'' وابستہ ہوتے تھے، جنہیں پڑھ یا سُن کر رونگٹھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ ہمارے تاریخ کے استاد نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ چین کے لوگ سو فیصد مانساہاری ہوتے ہیں اور ہر جاندار کو کھا جاتے ہیں۔ حالانکہ صرف ایک دن پہلے اسی استاد نے مہاتما گوتم بدھ کے بارے میں فرمایا تھا کہ مہاتما بدھ کبھی کسی بھی جاندار شئی کو تکلیف پہنچانے کے خلاف تھے۔ اور یہ کہ ''بودھ'' کبھی کسی جاندار کو ہلاک نہیں کرتے، خواہ وہ جاندار کوئی حقیر سا کیڑا ہی کیوں نہ ہو۔

اور ہم جانتے تھے کہ چین میں بودھ مت کے ماننے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ ہمارے محترم استاد نے جب مزید جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ جنوب مشرقی چین اور شمالی علاقوں کے چینی بوڑھوں اور بوڑھیوں کو نہ دفن کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی لاشوں کو جلاتے ہیں بلکہ وہ ان کے اعضاء کاٹ کر تحفتاً اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو بھیجتے ہیں تا کہ وہ انہیں پورا سمان بخشیں اور بھون کر کھا جائیں اور 'بچوں' کے کباب بنا کر ناشتے میں بچھو کے اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔ نو عمر کتوں کو بریانی اور جانور کا گوشت کھلاتے ہیں اور جب کتا نہیں کھاتا تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا پیٹ بھر گیاہ۔ پھر ایک پائپ کے ذریعے پیٹ میں براستۂ حلق ایک مخصوص شراب بھری جاتی ہے اور اس میں جملہ ڈرائی فروٹ پیس کر ملا دیئے جاتے ہیں اور اس کے بعد کتے کا منہ اور نتھنے اور باقی سوراخ اور درزیں بند کر کے بند کر دیئے جاتے ہیں اور اسے دُم سے پکڑ کر گھمایا جاتا ہے۔ جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ کتے کے جسم میں بھرا ہوا مصالحہ Mix ہو گیا ہے تو اسے اُٹھا کر اُبلتے ہوئے پانی میں ڈرم میں پھینکا جاتا ہے۔ اس طرح سے کتے کا جسم پھول جاتا ہے اور اس کی کھال اور بال آپس میں رشتہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب کتے کی آنکھیں، ناک، منہ سب ایک ہو جاتے ہیں اور وہ کلی طور پر ''فارغ البال'' ہو جاتا ہے تو

اسے ایک ایسی کڑھائی میں ڈال دیا جاتا ہے جس میں تیل اُبل رہا ہوتا ہے۔ اُسے اچھی طرح فرائی کر کے ایک بڑے تھال میں رکھا جاتا ہے، جسے سب کنبے کے افراد اپنے اپنے چاقو سے کاٹتے رہتے ہیں اور یہ عمل دو تین دن تک جاری رہتا ہے۔

عظیم دیوارِ چین کے بارے میں ہمارے پہلے انشائیہ میں ذکر ہو چکا ہے اور چینی لوگوں کی بزلہ سنجی، ایمانداری، اخلاقی اقدار اور اصولوں کے بارے میں ہم نے وہ سب کچھ انتہائی ایمانداری سے قلمبند کیا ہے جو ہم نے وقتاً فوقتاً ملک کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا۔ لیکن اب کھُلا کہ وہ سب کچھ کافی نہ تھا، کیونکہ رفتہ رفتہ چین سے متعلق ایک نئی تصویر ہمارے ذہن میں اُبھر رہی ہے۔ بقولِ غالبؔ

کیوں نہ جنت میں جہنم کو ملائیں یا رب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہم جیسے کم ظرفوں کی یہ پیدائشی خصلت رہی ہے کہ ہم ہر بات کے صرف منفی پہلو کو ہی زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور قابل قدر مثبت چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً 'انسانی' گوشت کو راکھ اور خاک میں بدلنا یا ضائع کرنا چینیوں کے نزدیک مستحسن بات نہیں۔ "کیوں نہ اس کو ضائع ہونے یا سڑنے سے بچایا جائے اور اسے اپنی غذا بنا کر غلّے اور اناج کو بچایا جائے۔

اسے فوڈ ایٹم بن کر اس ملک کے لوگ اربوں روپئے بچا سکتے ہیں۔ چین کا مشہور مقولہ ہے کہ اگر کھانے کے لئے خالق نے ہمیں ایک منہ دیا ہے تو کمانے کے لئے دو ہاتھ اور سوچنے کے لئے ایک دماغ دیا ہے۔ اور اپنے دماغ اور ہاتھوں کو اپنے ملک کے لئے استعمال کرنا ہی حب الوطنی کہتے ہیں۔ یہ مقولہ کہ شہری پر ملک کو ترجیح حاصل ہے، اب اس ملک کے آئین کا ایک جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ **China as**

important than the Chanese.There can no human being with out a territory but territory can exit with out a citizen) جن کا مطلب یہ ہے کہ ''چین چینیوں سے افضل ہے'' اور زمین باشندوں کے بغیر ہو سکتی ہے، لیکن باشندے زمین کے بغیر نہیں ہو سکتے''

چین کے بارے میں ہماری معلومات کی ماخذ کتابیں اور ٹی، وی، چینل ہیں۔ چین میں جتنے بھی ٹی، وی، چینل ہیں، سب چینی بولتے ہیں.......اس سے ایک سبق ملتا ہے کہ یہ ترقی یافتہ قوم اپنی تہذیب اور ثقافت کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ زبان کسی قوم کی ثقافت کو زندہ رکھنے کا سب سے موثّر ذریعہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان چینیوں کے پروگرام دیکھ کر ہماری سمجھ میں خاک بھی نہیں آتی، لیکن Visuals (جھلکیاں) دیکھ کر ناظرین کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک چینل نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ چین کے لوگ بھی ہم جیسے ہی ہیں۔ یعنی بعض معاملات میں وہ بھی بیک وقت اشرف المخلوقات بھی ہیں اور ہمارے جیسے کمزور کردار اور چال چلن کے مالک بھی........بنایا تو ہمیں اُسی خالق نے جس نے چینیوں کو بنایا ہے، اس لئے کچھ ''گُن'' ہم میں مشترک ہیں۔ ہمارے ہاں جس چیز کا کال پڑا ہے، وہ ہے ''شہری حس'' اور یہ حس چینیوں میں بھی ہم جیسی ہے اور لگتا ہے کہ ہم میں بھی عنقا ہے۔

ایک ٹی، وی، چینل نے یہ انکشاف کر کے ہمیں ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا کہ چین کے اندر کئی مقامات پر لوگوں نے عظیم دیوارِ چین کو چھوڑ کر اس میں سے اینٹ اور پتھر چُرا کر اپنے مکانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس ڈاکومنٹری کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی تو مجھے ہوئی کہ چینی سیاح ہیون سانگ کو یہ شکایت تھی کہ اس کا گھسا پھٹا پرانا جوتا بونیار کے مندر سے کسی نے چُرا لیا تھا۔ کاش! کوئی مائی کا لال میرا پیغام ہیون سانگ

تک پہنچانے کے لئے تیار ہو جاتا کہ میں اس کی ساری شیخی نکال دیتا اور کہتا کہ میاں تمہارا جوتا جسے پہن کر تم چین سے پیدل چلے تھے، بونیار تک پہنچتے پہنچتے اس کی حالت کیسی ہوئی ہوتی۔ کیا وہ جوتا کہلوانے کا مستحق رہا ہوتا۔؟ کیونکہ آخر وہ جوتا اگر ہوتا تو چمڑے کا ہو سکتا تھا، نہ کہ فولاد کا اور ہزاروں میل تک سنگلاخ چٹانوں اور گزرگاہوں، پانیوں، مٹی اور گارے کو عبور کر کے وہ جس جوتے کو پہن کر بونیا میں وارد ہوا تھا، کیا اُس چمڑی کے کمزور جوتے جو بھیگ کر پھول گیا ہوتا تو کتا یا بلی بھی تو اس کو چُرا سکتے تھے۔ اگر بونیار کے جیسے دیہاتی کو جوتا چُرانا ہی ضروری تھا تو اس نے کسی کا نیا جوتا چُرایا ہوتا۔ اور پھر آپ نے ''چھتر'' کے بدلے ہماری ریاست کشمیر کا ۲۲ ہزار کلو میٹر مربع کلومیٹر علاقہ یا تو ہتھیا لیا پھر صدر ایوب خان نے آپ کو تحفتاً پیش کر دیا۔ خود غرضی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے آپ کو اپنا پھٹا گھسا جوتا تو یاد ہے اور ہماری زمیں آپ ہڑپ کر گئے، اس کی بات ہی نہیں کرتے۔ جب میں نے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی دیوارِ چین سے ملحق علاقوں کے لوگوں نے دیوار کو توڑ کر اپنے گھر بنا لئے ہیں، تو ہمیں اپنے سرینگر کا وہ علاقہ یاد آ گیا جو جھیل سے ملحق ہے اور باغِ علی مردان سے لے کر بادام واری اور شنکر اچاریہ مندر سے لے کر قلعہٴ ہاری پربت تک پھیلا ہوا ہے۔ ملہ کھاہ سے پتھر مسجد کے درمیان اور حبک سے شالیمار تک جہاں ہزاروں سال پرانی تاریخی عمارتوں کے ساتھ بھی لوگوں نے یہی کچھ سلوک روا رکھا ہے، لیکن اس میں چینیوں کا کوئی قصور نہیں۔

چین کا جو دوسرا رخ ہمارے سامنے آ رہا ہے، جس سے مجبور ہو کر میں نے ''دوسرا چین'' لکھا۔ وہ یہ کہ موجودہ چین کے حکمران ایک ایسے نظریاتی منشور پر عمل پیرا ہیں، جس کے مطابق ہر اُس شخص کو خدا کے پاس بھیج دیا جاتا ہے، جو یہ کہتا کہ اُسے خدا نے بنایا ہے۔ ایک پولیس والے چینی میں اتنی ہمت آ گئی ہے کہ وہ ایسے چینی کو اپنے طور اپنے

حکم سے سزا دے سکتا ہے، جو یہ کہتا ہو کہ یہ سب کچھ (کھانا) خدا نے بنایا۔ چینی سپاہی اُسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے رکھ کر بھوکا رکھنے کے بعد پوچھے گا" کہو کیسا مزہ آ گیا........کیا خدا نے کھانا بھیج دیا"

کچھ ماڈرن یورپی ماہرین تعلیمات وسماجیات کا خیال ہے کہ "چینی پیٹ سے سوچتے ہیں"۔ چین نے کئی عالمی شہرت یافتہ مفکر اور دانشور پیدا کیے، جن میں لہہ سون، کنفیوشس، گستاشپ، لمباسن، ماوزے تنگ اور چواین لائی شامل ہیں۔ ان میں سے ماسوائے دو ایک کے سب مانتے تھے کہ کہ ہمیں کسی غیبی طاقت نے بنایا ہے، جو سورج کو روزانہ مشرق سے طلوع کرتا ہے اور آج تک کوئی چینی اس کا راستہ نہیں بدل سکا۔ لیکن صرف پیٹ نے انہیں پارٹی پیروکار بنا دیا، جس کا خالق جرمنی کا کارل مارکس یا مارک اینجل تھا..... یا پھر ماوزے تنگ... جنہوں نے گوتم بدھ کو اس ملک سے ملک بدر کر کے محنت کشوں کے اس ملک کو Arthies (دہریہ، ناستک) بنا دیا۔ قدیم چین یا پھر ایک ہزار سال پہلے کے چین کا سفر کرنے والے اسلامی سکالر جوازی ختلان نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ حرمینِ شریفین کے بعد مغربی چین اور صوبہ سنکیانگ مساجد اور عابدین کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقام دنیائے اسلام کا مستحکم حصار ہو گا۔ لیکن وہ چین یہ چین نہ تھا۔ یہ دوسرا چین ہے۔ اس کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تاہم تاریخ ضرور اپنے آپ کو دہرائے گی۔ ایک عظیم تر چین کے بعد دوسرا چین اور پھر ہو سکتا ہے، ہماری آنکھیں تیسرا چین بھی دیکھیں۔ ہماری آنکھیں نہ سہی، لیکن آنے والی نسلیں ضرور اُس چین کو دیکھ لیں گی، جسے مستقبل کے مؤرخ تیسرا چین کہیں گے۔

نمک

جب ہم عمر کے لحاظ سے چھوٹے 'نادان' یا پھر نابالغ ہوتے تھے، تو ہم نے کبھی غیر معمولی واقعات اور اشیاء میں بھی کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہ کیا۔ مثلاً ماونٹ ایورسٹ اور چاند پر حضرت انسان کے قدم بلکہ خود انسان کا پہلی مرتبہ چاند پر پہنچنا۔ ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام صاحب کا انتقال ہو جانا۔ چچا گل محمد کے کتے کا پاگل ہو جانا، شریفاں کا بیاہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اس زمانے میں ہم جن باتوں کو اہمیت دیتے تھے، اُن میں سے کچھ باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بشیرا ہمارا لنگوٹیا تھا۔ اپنی شرارتوں کے سبب سارے گاؤں میں جانا جاتا تھا۔ موسم گرما میں ہم جس سے کوئی بھی کام نکلوانا چاہتے تھے، اُس کے لئے سکندر نام کا لڑکا تھا، جو شیر خان کے کھیتوں سے کھیرے چُرا کے لے آتا اور بشیرا گل زمان کے ناشپاتی پیڑ سے کچی ناشپاتیاں اُتار کر لاتا۔ بیلے میں گئی سرول کی جھاڑیوں سے کوئل، کبوتروں، یہاں تک کہ کوؤں کے انڈے لانا اور اُنہیں بھون کر ہمیں کھِلانا مختار پر یہ فرض تھا کہ وہ شہباز چاچے کی دکان سے گُڑ اور ناریل چُرا کر لائے ....یہ کارِ خیر وہ اُس وقت انجام دیتا، جب شہباز چاچا ظہر کی نماز پڑھ کر قیلولہ کرتا اور وہیں دُکان کے اندر خراٹے لینے میں مصروف ہو جاتا۔ یہ اسکول میں رِسس یعنی وقفے کا وقت ہوتا۔

آج ساٹھ سال کے بعد وہ سب باتیں یاد کر کے ماننا پڑتا ہے کہ ہم اہم اور قابلِ ذکر باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ پتہ نہیں ایسا ہم ہی کرتے تھے یا یہ وقت کا تقاضا تھا...... آج حالت یہ ہے کہ ہم اس سے بھی معمولی باتوں کا زبردست دھیان رکھتے ہیں۔

آج کی تاریخ میں ہم کچھ اس قسم کی زندگی جی رہے ہیں کہ بڑی بڑی باتوں کو ہی نہیں، بلکہ ایسی واہیات، بیہودہ اور عام قسم کی چیزوں کے نام وردِ زبان ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک ''شئی'' ہے ''نمک''! آپ نمک کا نام سُن کر کیوں چونک گئے۔ یہ بظاہر ایک معمولی اور سستی سی چیز ہے جو نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہر عمر کے لوگوں کی پسند ہی نہیں، اہم بھی ہے۔ دنیا کے سارے براعظموں کے مرد اور عورتیں اور بچے نمک کا غیر شعوری طور پر نہ صرف استعمال کرتے ہیں،، بلکہ اس کی اہمیت کو بھی سمجھنے لگے ہیں۔ جو کچھ بھی ''لوگ'' غذا کے طور کھاتے ہیں اِس میں نمک کی معمولی سی آمیزش ضروری ہوتی ہے۔ بلکہ اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو کوئی اسے کھاتا نہیں۔ حالانکہ ''نمک'' کی اوقات ہی کیا ہے۔ کبھی کوئی بھول کر بھی نہیں سوچتا کہ یہ ''نمک'' نام کی حقیر سی شئی آخر آئی کہاں سے ہے۔ بزرگوں سے سُنا تھا کہ ہندوکش کے سلسے میں ایک پہاڑ نمک کا بھی ہے۔ ...... یہ وہیں سے لایا جاتا ہے۔ پھر سُننے میں آیا کہ نمک سمندر سے نکالا جاتا ہے۔ ہم نے نہ ہندوکش دیکھا تھا اور نہ سمندر، بلکہ صرف دو طرح کے نمک دیکھے تھے۔ ایک بڑے بڑے بھورے رنگ کے کانچ کے پتھروں جیسے اور دوسرا چقماق کے پتھروں کے ٹوٹے ریزے جیسے۔ بڑے بڑے پتھروں والے نمک کو پاکستانی نمک کہتے ہیں، جسے لوگ خود تو نہیں کھاتے، بلکہ مال مویشیوں کو کھِلاتے اور چٹواتے ہیں۔ لیکن پاکستانی ہونے کے ناطے اس نمک کے ساتھ ایسی عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے جیسے کہ یہ

نمک کا ڈھیلا نہ ہو بلکہ نعوذ باللہ سنگِ اسود ہو...... دوسرے نمک کو پیس کر کھانا پڑتا تھا۔اور پاکستانی نمک کا بازار کا بھاؤ پانچ روپئے سیر (کلو) اور ہندوستانی نمک ایک روپئے میں پانچ کلو ملتا تھا۔اس لئے عقیدت والا مقدس متبرک نمک صرف مہنگا ہونے کے سبب کشمیر کے غریب اور امیر صارفین نہیں خریدتے تھے۔رفتہ رفتہ ہر کشمیری کے خون میں ہندوستانی نمک کی قابلِ قدر مقدار جمع ہوگئی، بلکہ چند سال پہلے اس نمک میں آیوڈین کی آمیزش بھی کردی گئی،اس کے لئے یہ بہانہ گھڑا گیا کہ اس سے گلٹر کی بیماری نہیں ہوتی۔دونوں نمک آج بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔متبرک نمک ڈھیلوں میں اور سمندری نمک پاوڈر اور سفید سفوف کی صورت میں ....جو نمک غریب کشمیریوں نے نہ کھایا نہ چاٹا،اس کی جائے پیدائش سے غائبانہ عقیدت اور پیار کا یہ عالم تھا کہ اسے صرف چوما جاتا (کیونکہ وہ مہنگا تھا) اور اس کی حق حلالی کا ثبوت دیا جاتا۔یہاں تک کہ ایک سیاسی پارٹی ۵۰ سال تک اپنے لیڈروں سے کہا کہ وہ اس بھورے رنگ کے کانچ نما نمک کا ایک ''دانہ'' اپنی شیروانی کی جیب میں رکھنا نہ بھولیں اور جب کبھی بھی انتخاب ہو، رائے دہندگان کو دکھا کر کہا جائے ''اس کا وطن دیں گے، تم ہمیں چنو'' اور وہ اس نمک کے دانے کی جائے پیدائش یعنی اس ملک کو اپنانے کی لالچ میں اس دانے والے امیدوار کے نشان پر مہر ثبت کردیتے۔پھر اس ڈرامے میں نیا ایک موڑ بھی آیا، جب ایک اور سیاسی جماعت نے اس ملک کے ساتھ آنے جانے کے کچھ راستے کھول کر اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کردیا۔پھر نہ رہا نمک کا دانہ ''نمک والی جماعت کا جادو اور نہ نمک ملک کی محبت''۔دوسری طرف ڈاکٹروں کی متفقہ رائے سے نمک کے استعمال کو Restricted بنا دیا گیا، کیونکہ اس سے فشارِ خون میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔آج کی تاریخ میں کشمیر کے سوفی صد لوگ نمک حلال اور نمک حرام سب

اس جان لیوا بیماری میں مبتلا ہیں ۔چنانچہ ہمیں بھی اس جان لیوا زہر کی اہمیت اور افادیت کا علم آج ۶۲ سال کے بعد ہوا، جب میرے معالج نے میرے بازو پر ایک پٹی باندھ کر ایک چھوٹے سے غبارے کو مٹھی سے دباتے ہوئے کہا''نمک بند کیجئے'' ......''لیکن نمک ......''''لیکن ویکن کچھ نہیں.....نمک حلالی اور نمک حرامی کا زمانہ گیا۔ اب اپنا خیال رکھئے، اگر آپ ہی نہ رہے تو ملکوں کا کیا کرنا، ملک تو لوگوں سے ہوتے ہیں، جس ملک میں لوگ ہی نہ ہوں، اُس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''

اس عمر میں ہمیں ایک عزیز شے سے جُدا کیا جا رہا ہے، حالانکہ ہم نے خوشاب کی وہ نمک والی پہاڑیاں بھی دیکھ لی ہیں اور بحرِ ہند کو بھی، جس کے کھارے پانی کو ٹھوس شکل میں بدل دیا جاتا ہے۔آج جب ہماری نظر گھر میں یا دکان میں رکھی گئی نمک کی تھیلی پر پڑتی ہے، تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے ہماری محبوبہ کو چھین لیا گیا ہے۔

ہاتھ

تخلیقِ آدم سے پہلے اللہ رب العزت نے جب بنی آدم کا ایک تصوراتی خاکہ تیار کیا ہوگا تو اُس میں رنگ بھرنے سے پہلے اس ماٹی کے پُتلے کے ہر انگ کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں سوچا ہوگا کہ کس اکائی کے ذمہ کیا کام رکھا جائے اور اعضاء کی اپنی اپنی مقامیت اور مناسبت کے لحاظ سے ایک طلسماتی پیکر تیار ہونے کے بعد اس میں ''روح'' ڈال کر اسے اشرف المخلوقات کا خطاب عطا کیا جانا قدرت کی ایک بے مثال کاریگری اور کمال ہے جو انسانی ذہن اور فکر سے بالاتر ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ مچھر اور کھٹمل کے پیٹ میں ۲۱ میٹر آنتڑیاں، گردے، کلیجہ، پھیپھڑے، دل، معدہ پتا کے علاوہ آنکھیں، کان، دانت، مسوڑھے اور ٹانگیں ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا کیڑوں یا پتنگوں کے علاوہ کروڑوں حشرات الارض ہیں جو صرف خوردبین سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اُن میں بھی یہ سب اعضاء ہوتے ہیں۔ یہ کاریگری خرد سے بالاتر ہے۔ تمام عقائد میں یہ حقیقت مشترکہ طور پر مسلّم ہے کہ قدرت نے کوئی بھی شئی بیکار نہیں بنائی۔ اسی طرح اُس نے انسانی شکل میں ایک شاہکار تخلیق کیا، تو اس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں بھر دیں اور اسے ایسے اعضاء سے سرفراز فرمایا کہ جن کے بارے میں انسان خود کچھ نہیں جانتا۔ اسی لئے وہ اپنے بدن کے اعضاء کا استعمال صحیح ڈھنگ سے نہیں کر پاتا۔

انسان اشرف المخلوقات صرف اس لئے نہیں کہ اسے اللہ کے حکم سے فرشتوں نے قرینے اور سلیقے سے بنایا ہے اور پھر جب رب العزت نے اس کے اندر روح پھونکی اور فرشتوں سے کہا کہ ''اس کو سجدہ کرو'' فرشتوں کے سردار عزازیل کو تکبّر کی پاداش یعنی آدم کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں لعنت میں گرفتار کر کے اسے ہمیشہ کیلئے ملعون قرار دے دیا۔ اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسے خدا نے حیوانِ ناطق بنا دیا ہے۔ اسے سوچنے سمجھنے اور اچھے بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اور فاعلِ مختار بنا کر اس پر بہت سی ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد کئے اور اس کا درجہ روئے زمین پر موجود تمام مخلوقات سے بلند فرمایا۔ اور اشرف المخلوقات میں سے ہی انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام رسول، پیغمبر اور ولی پیدا کئے اور کائنات کو ایک عظیم ترین تحفہ اور رحمت حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات اقدس کی صورت میں بخش دیا۔

انسان آزاد ہے۔ جنت اور جہنم دونوں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ہاتھ کی بات چلی تو یاد آیا کہ یہ بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔ جیسے پاؤں، ٹانگیں، کان، آنکھیں، زبان اور ناک وغیرہ۔ ہر عضو کو اپنا کام تفویض ہے۔ ایک کام نہیں کئی کام نہیں، کئی کئی کام، لیکن مثبت، اگر وہ منفی کام کرتا ہے تو اُس میں اس کی اپنی مرضی کا دخل ہوتا ہے یا پھر شیطان اسے بہکاتا ہے۔

ایک واقعہ اعضائے جسم کی ماہیت اور اہمیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ سرزمینِ عرب میں ایک شخص نے اپنے ہی محسن کی بکریاں اور اونٹ چُرا لئے۔ وہ دوسرے شہر سے پکڑا گیا۔ شہر کے قاضی نے اُسے وہ سزا سُنائی جو اسلامی قوانین کے مطابق کسی چور کو دی جاتی ہے۔ یعنی اس کے دونوں ہاتھ کلائی کی جگہ سے کاٹ دینا۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر قاضی سے درخواست کی کہ حضور یہ ہاتھ مسجد شریف کی تعمیر کر سکتے ہیں، گارا بنا سکتے ہیں۔ قران پاک کو ہاتھوں میں پکڑ کر تلاوت کی جا سکتی ہے۔ یہ تکبیر کے

وقت اللہ اکبر کے لئے کانوں تک جاسکتے ہیں، ناف کے اوپر قیام کے وقت باندھے جا سکتے ہیں۔ کبھی بوڑھے، بھوکے یا بچے کے منہ میں غذا ڈال سکتے ہیں۔ یہ ہاتھ غفورالرحیم کے سامنے دعا کے لئے اُٹھ سکتے ہیں۔ "تو پھر اس کے پاؤں کو کاٹ دو"۔ قاضی نے کہا۔" یہ پاؤں بھلائی کی طرف اُٹھ سکتے ہیں۔ اگر پاؤں نہ ہوں تو یہ مسجد شریف تک کیسے چل کر جاسکتا ہے؟" "تو پھر اس کی آنکھیں نکال دو" "جناب اگر اس کی آنکھیں نکال دی گئیں تو قرآن شریف کی تلاوت کیسے کرسکتا ہے؟ اسے مسجد شریف کا راستہ کیسے دکھائی دے سکتا ہے؟۔ یہ کیسے سیاہ سفید اور، اچھے بُرے آسان اور مشکل نیز ماں بہن، بیٹی، بھائی، دوست اور دشمن میں تمیز کرسکتا ہے۔"؟ "تو پھر اس کی زبان کاٹ دو۔" "اگر اس کی زبان کاٹ دی گئی تو یہ اللہ کا نام کیسے لے سکتا ہے؟۔ یہ کلمۂ توحید کیسے پڑھ سکتا ہے؟۔ یہ مغفرت کی دعا کیسے مانگ سکے گا؟" "تو اس کے کان کاٹ ڈالو" جناب کانوں میں جب اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے تو بندہ نماز کے لئے مسجد میں جاتا ہے"۔ قاضی صاحب پریشان ہو گئے، فرمایا کہ آخر اسے کوئی نہ کوئی سزا تو ضرور دینی ہے، کیونکہ اس نے ایک نا قابل معافی جرم کیا ہے۔ ایک تو چوری اور پھر وہ بھی اپنے محسن کی، جس نے اسے فرش اور خاک سے اُٹھایا اور سماج میں سر اونچا اُٹھا کر چلنے کے لائق بنایا"۔ وہ آدمی (چور) بولا" حضور میں اپنا سب کچھ اپنے اس محسن کو دیتا ہوں۔ ایک تو اس کی بھیڑ بکریاں لوٹ دوں گا اور اس کے علاوہ میرے پاس جتنی بکریاں، اونٹ، دنبے اور گھوڑے ہیں، وہ سب بھی اسی کو دوں گا"۔ قاضی صاحب نے علماء سے مشورے کے بعد اسے یہی سزا دی۔ ایک ہاتھ کے بدلے اسے ایک اپنی تمام کمائی اور پونجی دینا پڑی۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیان، مذاہب اور عقاید میں ہاتھ کی اہمیت الگ الگ انداز سے ظاہر کی جاتی ہے۔ قدیم مذاہب میں سب سے پہلے مہا تما بدھ نے ہاتھ

کو امن وسلامتی کی ایک علامت سے تعبیر کیا ہے اور عدمِ تشدد اور ہاتھ کو آپس میں لازم و ملزوم قرار دیا۔ کیونکہ دنیا میں جتنا بھی تشدد ہوا ہے یا مظالم اور خون خرابہ ہوا ہے، اُس میں ہاتھ کا پہلا رول رہا ہے۔ اس کے بعد زبان آتی ہے۔ اور جن ہاتھوں سے انسانیت کی قبا چاک کی گئی ہے، اُن سے آج تک ہر بندہ اللہ کی پناہ مانگ رہا ہے۔ ہندومت میں ہاتھ شانتی، صبر اور محبت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب میں ہاتھ کو ایثار، سخاوت اور بندگی کا علم بردار کہتے ہیں، جب کہ اسلام میں ہاتھ ایمان، تقویٰ اور اللہ تعالیٰ سے قربت کا ایک موثّر ذریعہ مانا جاتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ سر شیخ محمد اقبال تو اتنا تک فرما گئے ہیں ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفرین، کار کُشا، کار ساز

دینِ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان ہیں۔ اور مسلمانوں کے ایمان کی بنیاد مانے جاتے ہیں۔ اس ستونوں کو ایک ہی ہاتھ کی پانچ انگلیاں مان کر جب کوئی مسلمان کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرتا ہے اور اُس پر ثابت قدم رہنے کی قسم کھاتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ کھول کر اسے پنجہ دکھاتا ہے۔ آج کی تاریخ میں مسلمانوں کا ایک فرقہ ہاتھ کو اپنے عقیدے کا مرکز مانتا ہے اور ہاتھ میں موجود پانچ انگلیوں کو دینِ اسلام کی پانچ برگزیدہ ہستیوں سے منسوب کرتے ہیں، جن میں ایک بلند ترین اور عظیم شخصیت حضرت محمد صلعم کی ہے۔

ہاتھ سکھ مذہب کی ایک ناقابلِ تنسیخ مذہبی شناخت ہے۔ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں انسانی زندگی اور نظامِ حیات کے کئی اہم گوشے اُجاگر کرتی ہیں۔ یہودی ہاتھ کو دوستی، طاقت اور بقائے باہم کی علامت مانتے ہیں۔

ایک فلاسفر کا قول ہے کہ اپنا ہاتھ ہرگز دوسرے کے ہاتھ میں مت دو۔ اگر آپ کو

پختہ یقین ہو کہ آپ کا ہاتھ پاک ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا ہاتھ ناپاک ہو جائے۔ اگر ہاتھ انسان کو چھوڑ کر بندر، بن مانس یا کسی عفریت کا ہو تو اُس سے خیر کی امید رکھنا غلط ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جابر حاکم یا جماعت ہاتھ کا استعمال کرتی ہو تو اس کے ہاتھ سے اپنے آپ کو محفوظ کرنا ہی بہتر ہے۔ جس ہاتھ سے کسی کی بھلائی نہ ہو، اُس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ ایسے ہاتھوں سے خبردار اور ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ چہرے سے ہمیشہ لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں، لیکن ہاتھ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی مصافحہ کرتا ہے تو آپ اس کی سرشت کو پرکھنا چاہتے ہیں تو آپ موسم کی تمازت کو دیکھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملائیں۔ اگر شدید گرم موسم میں بھی اُس کا ہاتھ ٹھنڈا لگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ شخص کبھی مخلص یا سچا دوست نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک بے فیض اور خود غرض ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ کسی دوست سے جاڑے میں مصافحہ کریں اور اس کا ہاتھ گرم ہو تو ایسے دوست کی دوستی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق ارشاد ہوا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

ماوزی تنگ کا قول ہے کہ کسی کو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیئے۔ جس آدمی کے دو ہاتھ ہوں۔ کیا وہ ایک منہ نہیں بھر سکتا؟۔ ہاتھ جو تاج محل بنا سکتا ہے، بھوکے کو کِھلا سکتا ہے، آسمانوں میں جہاز اور راکٹ اُڑا سکتا ہے، بہترین تخلیقات تصنیف کر سکتا ہے، انصاف کے کاغذ پر دستخط کر سکتا ہے، کسی کو پھانسی سے بچا سکتا ہے، تو کسی کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈال سکتا ہے محتاج کو ایک روٹی دے سکتا ہے۔ تو کسی کی جیب بھی کاٹ سکتا ہے۔ القصہ یہ مثبت اور منفی صفات کا مرکب ہوتا ہے۔

سالے

سالے دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا میں آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ سالے چین میں ہوتے ہیں، دوسرے نمبر پر ہندوستان آتا ہے۔ جس ملک میں سب سے کم سالے ہوتے ہیں، اُس کے بارے میں فی الوقت ہمارے پاس عالمی مردم شماری گیزٹ کے اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں روزانہ کم وبیش دس لاکھ لوگ سالے بن جاتے ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق دنیا کا ہر مرد اور ہر عورت بلا لحاظِ مذہب وملت، رنگ ونسل، ذات و جماعت، درجہ وزبان وعمر بالترتیب سالا اور سالی ہوتے ہیں۔ اور ہر سالے کے بھی سالے ہوتے ہیں۔ ایک یا ایک سے زیادہ، لیکن سالی کی کوئی سالی نہیں ہوتی۔ اس لئے سالی مظلومہ قرار دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کا صرف ایک سالا ہوتا ہے، وہ خود ایک سے زیادہ سالوں کا سالا ہوتا ہے۔

ہر ملک کی علاقائی زبان میں اس رشتے کے لئے اپنا کوئی مقامی لفظ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں تو صرف دو تین الفاظ سالا کے نعم البدل ہیں، جن کا ہمیں علم ہے۔ مثلاً فارسی میں سالے کو برادرِ نسبتی کہتے ہیں، جو دو الفاظ کا مرکب ہے۔ اور انگریزی میں بردر اِن لا، جو تین الفاظ کا مرکب ہے، لیکن جو کشش اردو یا ہندوستانی کے سالے کو نصیب

ہوئی ہے، وہ شاید کسی اور زبان میں اس رشتے کے حوالے سے کسی لفظ کو حاصل نہیں۔ حالانکہ مندرجہ بالا دونوں الفاظ میں برادر یا بردر جیسے پیارے اور عزیز ترین رشتے کے مظہر الفاظ موجود ہیں۔ ہمارے خیال میں دنیا کے تمام رشتوں کے معنی آج کل کے زمانے میں بدل گئے ہیں۔ لیکن "سالا" یا "سالی" کے معنی اپنے اصلی روپ میں موجود ہیں۔ البتہ ہماری بدتمیزی اور بدزبانی کی وجہ سے اس مقدس رشتے کو بعض اوقات گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے ایک سالا دوسرے سالے کو قتل کی حد تک سزا دے ڈالتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ سالوں کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ سالے اور سالیاں ممبئی میں رہتے ہیں۔ اس رشتے کو ممبئی میں جو مقبولیت اور اپنائیت حاصل ہے، وہ پوری دنیا میں کہیں اور نہیں۔ ممبئی میں کئی قسم کے سالے اور سالیاں پائے جاتے ہیں۔ اصلی سالے اور دو نمبر کے سالے۔ یہ ممبئی کے علاوہ کہیں اور بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ممبئی کے سالوں اور سالیوں کی خصوصیت قابلِ ذکر ہے۔ دو نمبری سالوں کے علاوہ یہاں ایسی اور بھی سالیاں بھی ہوتے ہیں، جن کی نہ کوئی بہن ہوتی ہے نہ بھائی۔ باقی دنیا اور ممبئی کے سالوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ممبئی میں ہر جاندار اور بے جان کو سالا یا سالی کہا جاتا ہے۔ اور ممبئی والے اس کو گالی نہیں سمجھتے، بلکہ یہ لفظ وہاں کا ہر شہری دوسرے شہری کے لئے پیار اور محبت سے استعمال کرتا ہے۔ کچھ تو اسے اپنی عزت افزائی کے طور پر قبول کر لیتے ہیں اور اس کے جواب میں اس پیاری سی گالی دینے والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ممبئی میں سالے سے بڑھ کر اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو مخاطب سے خلوص اور عزت افزائی کے اظہار کا وسیلہ ہو۔ مثلاً بیٹا اپنے باپ کو اور باپ

اپنے بیٹے کو فخر سے سالا کہہ کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بھائی کو، دوست کو، اجنبی کو، افسر کو، ماتحت کو، پولیس والے کو، تاجر کو، انڈر گراؤنڈ ڈان کو، مولوی، پنڈت یا پادری کو سالا کہنا کوئی عیب نہیں مانا جاتا۔ اسی طرح کتے، کوے، بلی، ہاتھی، سور، بندر، ٹیکسی، ریل گاڑی، آٹو رکھشا، ہوائی جہاز، ٹھیلا........غرض کہ ہر بے جان چیز بھی سالا یا سالی کے خطابات سے نوازے جاتے ہیں۔ جیسے پنجابی ایک جملے میں ہر لفظ کے سیاق وسباق کے طور پر "بہنچ" اور "مانچ" کا بے تکلفانہ استعمال کر کے اسے کلامِ موزون کے قریب کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ایک ایسی آزاد غزل غیر شعوری طور پر عرض کر دیتے ہیں، جس میں قافیہ اور ردیف میں سے صرف ایک ہی چیز ہو۔ ہم نے ایک مرتبہ جرأت سمیٹ کر ممبئی میں اُپنے ایک جاننے والے سے پوچھا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ممبئی کاسموپولیٹین حدود کے اندر کتنے سالے رہتے ہوں گے"؟ میرے اس مہمل سے سوال کا جواب بظاہر بہت مشکل تھا، لیکن اُس شخص نے اس سوال کے جواب میں صرف ایک لفظ کہا "سب"..... "سب سے آپ کا کیا مطلب"؟ سالی ممبئی میں سب سالے لوگ رہتے ہیں" ایک کروڑ سالے اور سالیاں، سسرے ممبئی کے پراچین باسی ہیں۔ تقریباً ۵۰ لاکھ سالے باہر سے آجاتے ہیں۔" اس......کے اس جواب سے مجھے محسوس ہوا کہ اس ......نے مجھے گالی دے ڈالی۔ مجھے تو ضرور غصہ آیا، لیکن میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی کہ کہیں یہ کچھ اور نہ کہہ ڈالے۔ بہر حال قریب کھڑے حوالدار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا...... "ماما سالے کے پاس سارا ریکارڈ ہے۔ وہ سالی نگر پالیکا میں سالی جن سنکھیا وبھاگ میں سالا بابو ہے۔" میرے جاننے والے........نے پھر کہا سیٹھ اپن تم کو ایڈریس دیتا ہے........تم کا لینا، جاؤ ودیا نگر....ایسے سوالوں کا اُتر کو سالے وِدیا نگر میں ملے گا۔" وِدیا نگر ممبئی یونیورسٹی کو کہتے ہیں، جہاں کئی اور تعلیمی ادارے بھی موجود ہیں۔

چنانچہ میں نے ایک سالی .... میرا مطلب ہے، ٹیکسی لی اور کم سے کم سومنٹ کے سفر کے بعد کالیناوِدیانگر پہنچ گیا۔ میں سیدھا شعبۂ اردو کی عمارت میں پہنچا۔ فسٹ فلور میں اساتذہ کے روم ہیں۔

کاریڈور میں غالب، اقبال، پریم، چند، امیر خسرو، مومن، ناسخ، آتش، فیض، جوش، چکبست ، حالی وغیرہ کی تصاویر دیواروں کے ساتھ دیکھ کر پہلی مرتبہ ایسا لگا جیسے میں نے علمی وادبی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ میں شعبۂ اردو میں تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہرا اور اردو کی اہم شخصیات سے ملاقات کی۔ ان میں ایچ، او، ڈی، ڈاکٹر رفیع شبنم عابدی، اور ڈاکٹر عبد الستار دلوی بھی شامل ہیں۔ جب میں نے ان حضرات سے پوچھا کہ ''سالا تکیہ کلام بن جانے کی کیا وجہ ہے؟ تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایچ، او، ڈی، صاحبہ کے روم میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا جیسے بنگالیوں کا تکیہ کلام دادا:: ہے، جنوبی ہند کے لوگ ہر مرد کو بھایا اور عورت بلا امتیازِ عمر ''اماں'' یا ''اوماں'' کہتے ہیں، ممبئی میں سو سال پہلے ہر اپنے پرائے شخص کو ''نانا'' کہتے تھے اور گجرات میں ''بھائی'' اور ''عورتوں'' کو ''بہن'' کہتے ہیں۔ چائے پلانے کے علاوہ انہوں نے مجھے ایک نظم بھی سنائی، جو ممتاز و معروف مزاحیہ شاعر دلاور فگار نے لکھی۔

گفتگو میں بھی یہاں ایک خاص اندازِ عام
کل کسی سے کہہ رہے تھے اک بزرگِ نیک نام
ہم تو شالا روز تم شالے کو کرتا ہے شلام
اور تم شالا کبھی کرتا نہیں ہم سے کلام

کُرسی

کُرسی عربی کا لفظ ہے، جو گرائمر کے حساب سے اسم ہے اور جنس کے لحاظ سے مونث۔ حالانکہ اس کا مذکر نہیں ہوتا۔ یہ چار حرفی لفظ دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی زبانوں میں رائج ہے۔ ہم تو اسی دن سے اس لفظ کو بولنے لگے تھے، جب ہم نے بولنا شروع کیا۔ باقی ہر لفظ کو توتلی زبان میں بولتے تھے، لیکن ''کرسی'' کو کبھی ''کلسی'' نہیں کہا۔ اردو پڑھنا شروع کی اور ''کرسی'' کی جب دوسری علاقائی زبان سے جان پہچان ہوئی تو وہاں بھی کرسی اپنی اصل شکل میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ البتہ فارسی میں کرسی کی جگہ صندلی دیکھ کر تعجب سا ہوا کہ پنجابی، کشمیری، سندھی، گجراتی، ہریانوی، اودھی، پشتو سب زبانیں جنوبی ایشیاء میں بولی جاتی ہیں۔ اور ان کے اور عربی کے بیچ میں فارسی ہے۔ پتہ نہیں کہ اس کرسی نے عرب سے کیسے اُڑ کر ہندوستان میں لینڈ کیا۔ دوسرے ممالک کی ہم بات نہیں کرتے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس ملک کو کچھ اس طرح اپنایا گیا ہے کہ یہ پسر پرورده کے بجائے پسرِ حقیقی لگ رہا ہے اور اس میں بلا کی کشش اور اپنائیت موجود ہے۔ ہر بندۂ خدا بلا تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، ذات و جماعت اور جنس وزبان

اس چیز سے بے حد پیار کرتا ہے اور اس کے حصول کے لئے سارے عالم کو تل پٹ کر سکتا ہے۔ اس کے چاہنے والے دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں، لیکن یہ ایک ایسی محبوبہ ہے، جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر بندۂ خدا ''رقیبِ روسیاہ'' تک بھی بن جاتا ہے۔ اور خون خرابے اور قتل و غارت سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ لیکن یہ ایسی ہرجائی محبوبہ ہے کہ یہ ہر ایک کی ہونے کے باوجود کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ مشہور مقولہ ہے کہ زر، زمین اور زن فسادات کی جڑیں ہیں۔ اگر ان میں کرسی کو بھی شامل کیا جائے تو بے جا نہیں ہو گا۔ کسی ماہرِ لسانیات نے کرسی کو چار الفاظ کا مرکب قرار دیا ہے۔ یہ چار الفاظ ''کرسی'' کے چار حروف سے شروع ہوتے ہیں مثلاً ''ک'' سے کُتّی ''ر'' سے ''رنڈی'' ''س'' سے ''سبکی'' اور ''ی:: سے یاس۔ یہ چاروں الفاظ بھی مونث ہیں۔

جب ہم طالب علمی کے دور میں تھے، جسے ہم ظلم و جبر اور بدترین غلامی کا دور کہتے تھے۔ ہمیں کہا جاتا تھا کہ گائے، بکری، گھوڑے اور کُتے پر بیس بیس جملے لکھیں۔ ان چاروں حیوانات کو ہم نے نہ صرف دیکھا تھا، بلکہ ان میں سے ایک یا دو ہمارے گھروں میں بھی پائے جاتے تھے۔ اردو کے استاد نے جب پہلی مرتبہ ہمیں گائے پر مضمون لکھوایا تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا۔ گائے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اس کے دو کان، دو سینگ، دو آنکھیں اور چار تھن ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ الگ بات ہے کہ گھوڑے اور کُتے پر مضمون لکھتے وقت ہم گائے کے بجائے گھوڑا لکھتے تھے، باقی وہی جو گائے والے مضمون میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ اُستاد نے حکم دیا کہ ''کرسی'' پر بیس جملے لکھو۔ میں نے گائے والا مضمون دیکھا اور پہلا جملہ لکھا ''کرسی'' کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں'' یہ لکھ کر میں رُک گیا اور یاد کرنے لگا کہ کرسی کو اور کیا کیا ہوتا ہے۔ ''چار تھن''......... نہیں......... ''دو سینگ'' .... نہیں، دو آنکھیں، دو کان،...... نہیں...... نہیں'' میرے بغل میں بیٹھے ہوئے

کلاس میٹ نے میری کاپی کو دیکھتے ہوئے کہا'' آگے لکھو........یار''.....کیسا مضمون ہے!........دیکھو نا کرسی ہمارے سامنے موجود ہے اور ماسٹر جی اس میں بیٹھے ہوئے'سو رہے ہیں،سنو خراٹے بھی لے رہے ہیں۔

ماسٹر جی ابھی جاگ جائیں گے اور ہماری خبر لیں گے۔ارے یار آگے کچھ لکھو نا.....'' ''تم ہی لکھو نا''

لکھو اس کے دو بازو بھی ہوتے ہیں۔یہ بیٹھنے کے کام آتی ہے۔ماسٹر جی اس پر سو جاتے ہیں۔ٹانگوں کے باوجود نہ حرکت کر سکتی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔اگر اس کی........ایک ٹانگ ٹوٹ جائے تو ماسٹر جی گر جائیں گے''۔

ماسٹر جی نے آنکھیں کھولیں......'' کاپیاں دکھاؤ''......یہ جملہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے کہ'' ماسٹر جی اس پر سو جاتے ہیں۔......کہنے لگے'' بدمعاشو! کیا تمہیں اس کے آگے کچھ نہیں سُوجھا اور کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔اقبال نے ہمت کر کے پوچھ لیا'' اگر اس کا کوئی اور فائدہ ہو تو براہِ کرم ہمیں سمجھا دیجئے۔ہمیں تو یہ ظلم،دھونس اور مار کی ایک خوفناک اور منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔جناب آپ ہمیں کھڑے ہو کر پڑھاتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم کے سمندر سے ہمارا ریگستان جیسا دماغ سیراب ہو رہا ہے اور علم کی روشنی خاموشی سے آپ سے ہمارے اندر منتقل ہو رہی ہے۔جونہی آپ کرسی پر بیٹھتے ہیں تو گویا ہماری شامت آ جاتی ہے........اسی لئے بشیر نے ایک ہفتہ پہلے اس کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی تھی۔جب ہم گائے پر مضمون لکھتے ہیں تو ہمیں گائے کے سینگوں سے ڈر نہیں لگتا۔جب ہم دودھ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں پورے وجود میں ایک ممتا بھری گرماہٹ اور شیرینی گھل جاتی ہے۔ہمیں گائے کی صورت میں ایک محسنہ دکھائی دینے لگتی ہے۔جب کُتے کا ذکر ہوتا ہے تو نجس العین ہونے کے باوجود وفادار دوست کا

مجسمہ ذہن کے قرطاس پر اُبھر آتا ہے اور میاں بخش کا یہ پنجابی شعر یاد آجاتا ہے۔

جس دل اندر عشق نہ رچیا کُتے اُس تھیں چنگے

مالک دے کہر راکھی کر دے صابر پُھکھے ننگے

یعنی جس شخص کے دل میں وفاداری اور عشق نہ ہو، اُس سے کُتے اچھے ہوتے ہیں ، جو صابر، بھوکے ننگے اپنے مالک کے گھر کی رکھوالی کرتے کرتے کبھی نہیں تھکتے، ''لیکن ہمیں کرسی کے اندر ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی''۔

ماسٹر جی نے غور سے سننے کے بعد کہا'' کون کہتا ہے کہ کرسی دودھ نہیں دیتی۔اس کے بے شک تھن نہیں ہوتے ،لیکن ہمیں کیا کیا نہیں دیتی ہے۔ یہ عزت دیتی ہے۔وقار اور دبدبہ دیتی ہے۔ سرمایہ دیتی ہے۔ بشرطیکہ اس پر بیٹھنے والا اس کے معنی جانتا ہو۔کرسی تو خدا کا عنایت کیا ہوا ایک انمول تحفہ ہے۔اس کے ساتھ جُڑی ہوئی اخلاقی اقدار کا تحفظ اور اسے اپنے خالق کی امانت سمجھ کر اس کا احترام اور صحیح استعمال سچی انسانیت کی دلیل ہے۔ کرسی کا غلط اور ناجائز استعمال اس کی عظمت کو ہرگز کم نہیں کرتا۔ اس پر بیٹھنے والے شخص کے کردار اور خصلت پر منحصر ہے کہ وہ اس کی بلندی کو پستی میں بدل دے یا پھر عرش کی بلندیوں تک پہنچائے۔ کرسی لکڑی، فولاد یا پلاسٹک کی بنی ہوئی ایک چیز کا نام ہے، جس پر ہر طرح کے لوگ بیٹھتے ہیں۔ حاکم ،صاحبِ اقتدار، منصف عادل، ڈکٹیٹر، تھانیدار، نائی، اور امام اور یہ کرسی جس پر میں بیٹھا ہوں ،یا پھر بقولِ تمہارے سوتا ہوں ......کوئی بھی شخص ہو......کرسی صرف ایک ہوتی ہے۔صاحبِ کرسی اگر اپنی کرسی کی قدر نہیں کرتا تو یہ بے زبان اور بظاہر بے جان سی شئی اُنہیں اس طرح سے فرش پر پٹک دیتی ہے تو وہ پھر دوبارہ اس پر بیٹھنے کا سپنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور ہم کرسیوں کے قصے نہ صرف سنتے

رہے، بلکہ اپنی آنکھوں سے گردشِ لیل ونہار کے ساتھ کرسی/تاج وتخت کی بے وفائیاں بھی دیکھیں اور کرسی کے لئے خون کی ندیاں بہتے ہوئے بھی دیکھیں۔ انسانی اور اخلاقی اقدار کو سولی پر چڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔

باقی روزمرہ میں لائی جانے والی گھریلو اشیاء میں کرسی بھی شامل ہے۔ لیکن گھر کی کرسی سے نہ کوئی ڈرتا ہے نہ اس کی عزت کرتا ہے۔ اور نہ اسے اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہی کرسی ہم کسی اور جگہ دیکھتے ہیں مثلاً کسی سرکاری دفتر میں، اس پر بیٹھنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے "صاحب" کی اجازت کے بغیر اس پر بیٹھا جائے یا......؟ صاحب کرسی کوئی بھی ہو،...وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے نیچے بچھی ہوئی کرسی اس کی جاگیر نہیں۔ نہ وہ کرسی اس کے نیچے عمر بھر رہتی ہے، نہ وہ اس کے اوپر عمر بھر رہ سکتا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی ہیں کہ کسی کو اللہ نے کرسی دی تو اس نے کرسی چھوڑنے سے انکار کیا اور اسے اپنی داشتہ یا زرخرید لونڈی یا پھر ذاتی جاگیر سمجھ کر اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ پھر اس کا انجام یہ ہوا کہ اسے اس کرسی سے بے آبرو ہو کے اُتارا گیا........ بعض نیک اور بے غرض لوگوں کو کرسی پیش کی گئی لیکن انہوں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کردیا۔ بعض کرسیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن پر ان کا مالک بھی نہیں بیٹھتا۔ مثلاً نائی کی کرسی اور بیوٹی پارلر میں رکھی ہوئی کرسی۔

مصر کے صدر ناصر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پورے صدارتی زمانے میں صرف ایک سو اسی بار صدر کی کرسی پر بیٹھا۔ یہی بات پنڈت نہرو، انڈونیشیاء کے صدر عبدالرحیم سوئیکارنو، ماوزی تنگ اور یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کے بارے میں بھی مشہور ہے۔ فارسی میں پرانی کہاوت ہے کہ "صدر ہر جا کہ نشت، صدر است" یعنی صدر جہاں بھی بیٹھے، صدر ہوتا ہے۔ گلاب کا پھول اگر گندی نالی میں بھی اتفاقاً

گر جائے، تو اسے گلاب کا پھول ہی کہا جاتا ہے۔آپ ذرا اپنے زرخیز ذہن پر تھوڑا سا زور دیجئے تو آپ کو کئی ایسے نام یاد آئیں گے جو کبھی کرسی پر نہیں بیٹھے، نہ کبھی کرسی کی خواہش کی، لیکن قیمتی ہیرے جواہرات سے سجے تاج سر پر رکھے ایسے کئی شخصیات کے سر اُن کے قدموں میں جھکے رہتے تھے۔ایک کہاوت ہے" دمس سائتی چھونمسکار"، یعنی جو لوگ صاحب ثروت، سرمایہ دار یا پھر صاحب اقتدار ہوتے ہیں، اُن کو اُسی لمحے تک سب سلام کرتے ہیں، جب تک کہ وہ اُس پوزیشن میں رہیں۔ہم نے کئی ایسے حضرات کو دیکھا ہے، جو اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔بسوں میں کھڑے کھڑے سفر کررہے تھے۔یا پھر سبزی بازار میں آلو اور بھنڈی عام شہریوں کی طرح خرید رہے تھے۔ایک ریٹائرڈ جج صاحب کو دیکھا، جو ایک ریڑے والے سے اُلجھ رہے تھے، جو بھنے ہوئے چنے بیچ رہا تھا۔ایک فوجی افسر جب ریٹائرڈ ہو کر گھر پہنچا تو اُسے نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کئی سال لگ گئے۔پہلے دن جب وہ صبح نیند سے جاگا تو وہاں کوئی اردلی تھا نہ سپاہی، نہ کسی نے سلیوٹ دیا، نہ وہ پروٹوکول جس کا وہ عادی تھا۔البتہ بیوی نے جھنجوڑتے ہوئے اُسے کہا ...." جاؤ بازار سے انڈے اور سبزی لے آؤ ناشتے کے لئے........ پہلے تو اُسے بہت غصہ آیا، لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد اُسے یاد آیا کہ وہ اب کوئی افسر وفسر نہیں، بلکہ ایک سادھارن قسم کا شوہر ہے............ایسے شوہر ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔

بہر کیف قصہ کرسی کا چل رہا تھا اور کرسی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک داستان کا عنوان بن کر رہی ہے۔جب تک زمین و آسمان باقی ہیں، یہ کرسی موجود رہے گی، خواہ اد پر کوئی بیٹھے یا خالی رہے۔ایک بس کے اندر پینٹ کیا ہوا یہ شعر حسب حال بھی ہے، اور موضوع کے ساتھ کچھ میل بھی کھا رہا ہے۔

دنیا میں محبت والوں کی تقدیر بدلتی رہتی ہے

اُس تصویر کو بھی یاد کیجئے جو شیشے کے فریم میں لگی ہو۔ شیشے سے مراد وہ فریم ہے، جس میں تصویر مُڑ کی جاتی ہے۔ میرا ایک دوست ہے، جو الیکشن کے آخری دنوں وزارت اعظمیٰ کے امیدوار کے نام خط لکھ کر رکھ دیتا ہے، جس میں وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کے نام کی جگہ خالی چھوڑتا ہے، غرض جو بھی کامیاب ہو جائے......خالی جگہ میں اُس کا نام لکھ دیتا ہے۔ ایک دفتر کی دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئے فریم میں، میں نے ہر دو چار سال کے بعد ایک نئی تصویر مُڑی ہوئی دیکھی ہے۔

ایک صاحب کو ایک دفتر میں دروازے کے پاس پڑے ہوئے ٹول پر بیٹھے دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا "آپ یہاں کس کام سے آئے تھے"؟ اُس نے ایک لمبی آہ کھینچ کر کہا "آج سے دو ماہ پہلے میں اُس کرسی پر بیٹھا تھا، جس پر وہ بابو بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج میں اپنے ایک ذاتی کام کے لئے آیا ہوں، لیکن جب وہ صاحب اپنے کام سے فارغ ہوں گے، تب میری طرف دیکھیں گے۔ دراصل یہ کرسی.............!"

ماں

سورۂ رحمٰن میں خالقِ کائنات نے بار بار ہم سے پوچھا ہے کہ ''تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے''۔

ہمارے رب نے ہمیں مختلف صورتوں میں اس قدر انعامات و اکرامات سے نوازا ہے کہ انہیں جھٹلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے عطیات اور نعمتوں کی فہرست بنائی جائے تو برس ہا برس درکار ہیں۔ سارے سمندر اگر روشنائی بن جائیں اور ساری دنیا (زمین) قرطاس بن جائے تو تب بھی اُس کے انعامات و اکرامات، عنایات، و تحائف کی فہرست مکمل نہیں کی جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی جملہ نعمتوں میں سب سے پہلا درجہ ''ماں'' کو حاصل ہے، جو ہمیں جنم دیتی ہے.......... ماں کے بغیر نہ کوئی پیدا ہوسکتا ہے نہ ہوگا۔ صرف ایک ذات ایسی ہے کہ جس کی تخلیق اللہ رب العزت نے بغیرِ ماں کے فرمائی۔ وہ ہیں ہم سب کے باوا آدمؑ۔ دنیا کی پہلی بیوی اور ماں حضرت اماں حوا کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہر انسان کی 'ماں' ہے۔ اگر خالق نے حوا کو پیدا نہیں کیا ہوتا تو آج نہ ہم ہوتے اور نہ

آپ، نہ ڈارون، ہوتا اور نہ کوئی یہ کہتا کہ ''ہم بندر کی اولاد ہیں'' نہ کوئی سوال اُٹھتا اور نہ کوئی جواب دینے والا ہوتا۔

معلوم دور میں پائے جانے والے تمام مذاہب وعقائد اور ادیان نے ماں کی عظمت، برتری اور اس کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی تعظیم وتکریم کرنے کو زندگی کا اولین مقصد اور فرض قرار دیا ہے۔ دینِ اسلام نے تو اس خاتون کو جس نے کسی دوسرے کے بچے کو صرف ایک بار دودھ پلایا ہو، سگی ماں جیسا درجہ دیا ہے۔ دائی حلیمہ کو اسلام میں بی بی آمنہ کے برابر شمار کیا جاتا ہے۔ بی بی مریم دنیا کی واحد خاتون ہیں جو ایک ایسی ماں ہیں، جو بیوی نہیں۔

ماں خواہ کسی پیغمبر کی ہو، ولی کی ہو، شہنشاہ کہ ہو، آقا یا غلام کی ہو امیر یا فقیر کی ہو، آجر یا اجیر، محنت کش یا مزدور کی ہو، بہر صورت ماں ہوتی ہے اور اس کی تعظیم اس کے اولادوں کے حوالے سے نہیں کی جاتی.........نہ سوسائٹی میں ان کے سماجی مرتبے (Status) کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ کسی کی بھی ماں ہو وہ صرف ماں ہی رہتی ہے۔ ہر مذہب اور عقیدے نے اپنے ماننے والوں سے ماں کی اہمیت اور عظمت کو جاننے اور سمجھنے کی تلقین کی ہے۔ ماں کے تقدس اور حرمت کا اندازہ ان اقوالِ زرّین سے لگایا جاسکتا ہے۔

☆ سرورِ کائنات، سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے ''جنّت ماں کے قدموں کے تلے ہے''۔

☆......امام رازی کا قول ہے ''دنیا کی تمام خوشیاں ''ماں'' کہتے ہی مل جاتی ہیں۔''

☆......ماں کا حکم ماننا بھی عبادت ہے (حضرت غوث الاعظم دستگیر)

☆......سخت سے سخت دل بھی ماں کی آنسو بھری آنکھیں دیکھ کر موم کی طرح پگھل جاتے ہیں۔(خلیل جبران)

☆......دنیا کی سب سے بڑی ہستی ماں ہے صرف ماں......(محمد علی جوہر)

☆......بچے کے لئے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے، چاہیئے بچے کی عمر کتنی ہی ہو۔(حافظ شیرازی)

☆......ماں کے حکم کو اپنے اوپر پرمہاتما کا حکم مانو اور اس کی تعمیل کرو، اس سے پرمہاتما خوش ہوگا..........................(رام چندر جی)

☆......ماں مجسمہ محبت و وفا ہے........یہ نصیب والوں کو ملتی ہے۔(کالی داس)

☆......انسان کے لبوں سے ادا ہونے والے تمام الفاظ میں سب سے زیادہ خوبصورت لفظ ماں ہے اور حسین ترین تخاطب.........'میری ماں'

☆......اگر خدا یہ وعدہ کرے کہ وہ میری دعا قبول کرے گا تو میں صرف اس سے دو چیزیں مانگوں گا.......ماں اور بچپن (نپولین ہل)

☆......دنیا کا کوئی آسمان یا چھت ماں کا نعم البدل نہیں ہوسکتا.....(کنفیوشس)

☆......خدا کو وہ یتیم بہت پیارے ہوتے ہیں جن کی ماں نہیں ہوتی......(بودھ نظریہ)

☆......کسی شاعر کا یہ شعر کنفیوشس کے قول کی ترجمانی کرتا ہے:

میرے خدا میری ماں کو نہ مجھ سے جُدا کرنا
بغیر ماں کے تو مجھ کو سائبان کاٹے گا

جب ہم دنیا کے عظیم مفکرین اور دانشوروں کی بات کرتے ہیں تو اُن کی ماؤں کے لئے تحسین و آفرین کے کلمات خود بخود زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ بدلنے اور اس میں نئے ابواب کا اضافہ کرنے میں "ماں" کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

ہندودھرم میں رامائن اور مہابھارت میں جیسی مذہبی کتب میں بیان کی گئی داستانوں میں ’’مائیں‘‘ مرکزی کردار کی حامل رہی ہیں۔ کیکئی، کوشلیا، رادھا اور شیاما اور پاروتی، ہندو لوگ ان ماؤں کی پوجا کرتے ہیں۔

دین فطرت اسلام میں حقوق الوالدین کی پیروی کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ ماں کے حقوق کو خصوصیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ اگر نماز کی ادائیگی کے دوران تمہیں ماں بلائے تو نماز کو درمیان میں ترک کر کے پہلے اپنی ماں کا حکم بجالاؤ۔ بس اس کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہر ماں کی ایک ہی علامت ہے۔ بے لوث محبت، قربانی اور شفقت۔ تین حروف کا یہ مٹھاس بھرا اور مقدس مرکب لفظ جس کا سابقہ قربانی اور لاحقہ شفقت کا ایک بحرِ بیکراں ......! یہ لفظ جس زبان سے بھی ادا ہو جاتا ہے، سماعت میں رس، مٹھاس اور شیرینی گھول دیتا ہے .... بصارت میں نور بکھیر دیتا ہے۔ خواندہ حضرات جانتے ہیں کہ ماں کے لئے دنیا کی ہر زبان میں بھلے ہی الگ الگ الفاظ کیوں نہ ہوں، مگر یہ الفاظ ’’م‘‘ سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً فارسی میں مادر، انگریزی میں ’مدر‘، ہندی میں ’ماتا‘ یا ماتر‘، اردو میں ’ماں‘ چینی میں ’مم‘ عبرانی میا ’ما‘ کشمیری میں ’موج‘ اور جن زبانوں میں ’م‘ سے شروع نہیں ہوتا، اُن میں بھی ’م‘ درمیان یا آخر میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ’ام بنگلہ میں ’اوماں‘۔ اس حیرت انگیز مماثلت کی وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب کبھی بھی انسان یا حیوان کے بچے کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا وہ مدد کے لئے کسی کو پکارتا ہے تو اُس کے منہ سے ’’ماں، ماؤں، ما، میوں، مم، مما، ممی، موم، موجی یا اماں جیسے الفاظ فطری طور پر ادا ہو جاتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق ۹۰ فی صد بچے جب بولنا شروع کرتے ہیں، حتیٰ کہ گونگے بچے بھی یہ الفاظ بول سکتے ہیں۔

آج کے ہر دانشور، شاعر اور ادیب نے اپنی نگارشات کم سے کم 'ماں' کو نہیں بھولا ہے۔ شعراء نے مختلف انداز سے ماں کو دل سے نکلی ہوئی آواز کو الفاظ دے کر کچھ اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک غریب ماں اپنے بھوکے بچوں کے لئے چولہے پر پانی چڑھا کر انہیں بھیگی پلکوں سے لوری سُناتی ہے اور کہتی ہے کہ بس کچھ ہی دیر میں کھانا تیار ہوا چاہتا ہے اور جب بھوکے بچے سو جاتے ہیں تو وہ محلے یا گلی میں ان کے لئے کھانا مانگنے نکل جاتی ہے۔ ایک شاعر کا یہ شعر بچے کے تئیں ماں کی بے پناہ محبت اور قربانی کی عکاسی کچھ یوں کرتا ہے۔

بھوک بچوں کی چولہے پہ چڑھا کر
لکڑی لکڑی سلگ رہی ہے ماں
مجھے اب خوب نیند آتی ہے
چہار قُل پھونک کر گئی ہے ماں

بچہ انسان کا ہو یا حیوان کا، اس کی فطرت اس سچائی کی گواہی دینے کے لئے کافی ہوتی ہے، کہ اسے باپ سے زیادہ 'ماں' سے پیار ہوتا ہے۔ وہ ماں کو چھو کر یا اُس کی بو سونگھ کر پہچان لیتا ہے۔ جب انسان کے بچے کا نام رکھا جاتا ہے (عام طور پر) تو ابجد میں صرف اس کی ماں کا عدد اس کے عدد کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ تعویذات میں بھی باپ کے بجائے ولدیت میں ماں کا نام ہی لکھا جاتا ہو، خواہ اس کی ماں زندہ ہو یا مرگئی ہو۔ یعنی مرنے کے بعد بھی اس کی ماں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

ماں کی عقیدت میں چند اشعار مجھ کو یہ فرض نبھانے میں مزہ آتا ہے۔

ماں تیرے پاؤں دبانے میں مزہ آتا ہے
پاؤں میں ماں کے قندیلِ حرم روشن ہے

کس قدر پاک ہے معصوم رشتہ ماں کا
ایسے رشتے کو نبھانے میں مزہ آتا ہے
جب مصیبت کوئی سر پر ہو تو خود کو
ماں کے آنچل میں چھپانے کو مزہ آتا ہے

جاڑے کی ایک سرد ترین رات ہے۔ایک ماں اپنے گھر کے ایک ٹھنڈے اور تاریک سے کمرے میں ایک یخ بستہ بچھونے پر لیٹی ہوئی ہے۔ماں کی چھاتی سے اس کا ایک چھ ماہ کا معصوم بچہ چمٹا ہوا سو رہا ہے۔وہ بے فکر سو رہا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس ہستی کی آغوش میں موجود ہے جو اس کے خالق کے بعد سب سے بڑھ کر مہربان ہے۔وہ کوئی اور نہیں، وہ اس کی ماں ہے، جس نے اسے اپنے بطن میں ۹ ماہ تک رکھا اور اس کی پرورش کی۔شب و روز اپنے اس لختِ جگر کے لئے دعائیں مانگتی رہی، جسے وہ نہ جانتی تھی، نہ اسے دیکھا تھا۔بچے کی خاطر اس نے اپنے منہ کے مزے کو تیاگ دیا۔روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا۔تکالیف برداشت کیں، اس کی پیدائش کے بعد اس کی بلائیں لیں، وہ جاگتا تو ماں کے سپنے بھی جاگتے،،وہ مسکراتا تو ماں کے ارمانوں کے چمن میں گویا پھول کھِل اُٹھتے۔اُسے سلانے کے لئے لوریاں سُناتی۔چہار قُل پڑھ کر پھونک مارتی۔اس کی چھاتی سے لپٹا ہوا اس کا لختِ جگر اچانک رونے لگتا ہے، ماں کی جاگ کھل جاتی ہے۔اُٹھ کر دیا روشن کر دیتی ہے۔دیکھتی ہے کہ جس کپڑے پر بچہ لیٹا ہوا تھا، وہ گیلا اور سرد ہو چکا ہے۔دوسرا پوتڑا دستیاب نہیں۔ماں اس گیلے اور ٹھنڈے بچھونے پر خود لیٹ جاتی ہے اور بچے کو اپنی چھاتی پر سلا دیتی ہے اور رات اُس گیلے اور ٹھنڈے بچھونے پر گزارتی ہے۔جب ایک شخص نے ایک بزرگ عالم سے پوچھا "میں ماں کی بے لوث محبت اور ممتا کا حق چکانا چاہتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

بزرگ نے جواب دیا" ماں کی قربانی اور محبت کی صرف ایک رات کا حق سات جنموں تک بھی ادا نہیں کر سکتے۔ جب اس نے تجھے گیلے ٹھنڈے بچھونے سے اُٹھا کر اپنی چھاتی پر لٹا دیا تھا۔ تمہاری پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد، جب تک وہ بقیدِ حیات رہی، وہ پل پل، لمحہ لمحہ شمع کی مانند پگھلتی رہی اور تجھے حیات کی جملہ لذّات سے آشنا کیا۔ تم اُس کا قرض چکا سکتے ہو؟ بولو!۔ اُس شخص نے سر جھکا کر کہا، میرے اللہ! میری ماں کو واپس کر دے اور اُسے ہزاروں برس تک زندہ رکھ، تا کہ میں اس کے پاؤں دھو دھو کر پیئوں اور اس کی خدمت میں جو کسر باقی رہ گئی ہے، وہ پورا کروں!۔ لیکن زندگی میں خوش قسمت لوگوں کو ہی "ماں" ملتی ہے........ زندگی میں صرف ایک بار...........!!

بولی

بولی قدرت کا وہ انمول عطیہ ہے، جو اُس نے انسانوں اور حیوانوں کو عطا کیا ہے۔ خدا نے ہمیں یوں بھی اَن گنت نعمتوں اور عطیات سے نوازا ہے اور ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے، لیکن بولی ایک اضافی حس ہے جو خالق و مخلوق کے درمیاں افہام و تفہیم اور اظہار کا ایک انتہائی اہم وسیلہ ہے۔ یہ مخلوق کے درمیان رابطے کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے۔ یہ وسیلہ تخلیق آدم سے آج کی تاریخ تک قائم و دائم ہے۔ جب خالقِ کائنات کے حکم سے ایک خاکی پتلے کے اندر روح پھونگ دی گئی، تو اُس پتلے کے جس عضو میں سب سے پہلے حرکت پیدا ہوئی، وہ زبان تھی، جس میں سے سب سے پہلا کلمہ 'حق نکلا، جو آج تک بندوں اور خالق کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم کیئے ہوئے ہے۔ بولی کا تعلق زبان (جیب) اور کانوں دونوں سے ہے جیسے کہ ٹیلیفون میں رسیور اور موتھ پیس کا رشتہ ہوتا ہے۔ منہ سے نکلی ہوئی بات جو کانوں تک پہنچتی ہے، اُسے بولی کہتے ہیں۔ اس لئے گویائی اور سماعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

نباتات کو چھوڑ کر دنیا میں جتنے بھی جاندار ہوتے ہیں، سب کی الگ الگ اپنی اپنی بولیاں ہوتی ہیں۔ ان سب جانداروں میں سے صرف ایک حیوان ناطق یعنی آدمی

ہے، جوایک سے زیادہ بولیاں بول سکتا ہے۔ باقی سب چرند وپرند صرف وہی ایک بولی بولتے ہیں، جوفطرت نے انہیں عنایت کی ہوتی ہے۔ اسے ماں بولی یا مادری زبان کہتے ہیں۔ جو ہر جاندار اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے۔ ماں بولی کسی سکول یا مدرسے میں پڑھنے سے نہیں آتی، بلکہ جس سکول سے یہ سیکھی جاتی ہے، وہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ روتا ہے۔ یہ رونا اُس کو کس نے سکھایا؟ دراصل کچھ Insticts اور حواس اس کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان کی نشو ونما کہیں بے حد سست رفتاری سے ہوتی ہے، اُس کی نیند، اُس کا وزن، اُس کی ساخت بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے۔ ابتدا میں اُس کی زبان میں توتلا پن ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ مہمل الفاظ بامعنی بننے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے دو سال میں انسان کا بچہ روزانہ دس نئے الفاظ سیکھتا ہے۔ اس کے سیکھنے کا عمل غیر شعوری ہوتا ہے۔ ہر روز دس نئے الفاظ اس کے کانوں میں داخل ہوتے ہیں، جو پھر وہ کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے علمِ لسانیات میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دوسری بولیوں کے الفاظ بھی غیر شعوری طور پر سیکھتا رہتا ہے۔ مادری بولی کے علاوہ جو دوسری بولیاں بولنا چاہیئے تو وہ اسے کسی سکول یا مکتب میں سیکھنا پڑتی ہیں۔ انسان ضرورت کے مطابق یا محض شوقیہ طور پر درجنوں بلکہ کوڑیوں بولیاں بول سکتا ہے۔ بولی کی ترقی یافتہ شکل کو زبان کہتے ہیں۔ ہمارے منہ کے اندر گوشت کا ایک بے حد نرم ٹکڑا ہوتا ہے، جس میں کوئی ہڈی نہیں ہوتی، اسے بھی زبان کہتے ہیں اور بولی اسی عضو سے نکلتی ہے۔ اسے زبان کا مخرج بھی کہتے ہیں۔ آدمی اَن پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، وہ کئی بولیاں بول سکتا ہے۔ لیکن جس بولی کو وہ بول بھی سکتا ہو، سمجھ بھی سکتا ہو، لکھ بھی سکتا ہو اور پڑھ بھی سکتا ہو، اُسے زبان کہتے

ہیں۔ یہی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے سوا تمام مخلوقِ خدا اس سے محروم ہوتے ہیں۔ انسان واحد جاندار ہے، جو منہ میں ایک زبان رکھتے ہوئے بھی کئی بولیاں بول سکتا ہے اور متعدد آوازیں نکال سکتا ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ حیوان اور جانور بھی حسب ضرورت اپنی آوازیں بدل لیتے ہیں۔ جب مرغیوں میں ایک مخصوص بیماری رانی کھیت پھیل جاتی ہے، تو اُن کے گلے سے عجیب وغریب آوازیں نکلنا شروع ہوتی ہیں۔ اکثر مرغے اذان دینا بھی بھول جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گیدڑ ہر موسم میں اپنی بولی میں معمولی سی ترمیم کر لیتا ہے۔ شیر جب آزاد ہوتا ہے تو وہ اصلی بولی بولتا ہے۔ اگر پنجرے میں یا قید ہو تو اس کی گرج میں درد و کرب اور غصہ ہوتا ہے۔ زیرِ زمین حشرات الارض چوبیس گھنٹوں میں دو بولیاں پہلے سے فرق کے ساتھ بولتے ہیں۔ ٹڈی یا دیمک دن میں ٹھمری گاتے ہیں تو رات کو ملہار...... بلی عام طور پر بظاہر شریفانہ لہجہ رکھتی ہے، جو کانوں کو بھاتا ہے۔ جیسے کسی کے خوش آمدی الفاظ اچھے لگتے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں بلی رومانٹک ہو جاتی ہے اور ایسے بول بولنے لگتی ہے، جو کوئی دوشیزہ منگنی یا سگائی کے بعد بولتی ہے۔ اسی مختصر مضمون میں سب جانداروں کی بولیوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

مشہور کہاوت ہے جو بولی سے نہیں مرتا وہ گولی سے بھی کبھی نہیں مرے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بولی گولی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ جانوروں کے بولنے کو بولنا یا بولی کہتے ہیں۔ اگر آدمی کے گلے سے آواز نکلے تو اُسے کہنا، بتانا یا بولنا کہتے ہیں۔ بولنے کے عمل میں جو جسمانی اعضاء ملوث ہوتے ہیں، ان میں منہ (دہن)، تالو، دانت، مسوڑھے، حلق، خرخرہ اور ہونٹ شامل ہیں۔ مختلف الفاظ کے بولتے وقت مختلف حصے ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ بولنے کے عمل کے دوران لہجے میں زیر و بم

ہوتے ہیں۔ بعض اوقات مرد کے دہن سے نسوانی آواز نکلتی ہے اور خواتین کے حلق سے مردانہ آوز...... لیکن کلمے کی ساخت اور تلفظ میں فرق نہیں آتا۔

ماہرین کے ایک سروے کے مطابق دنیا میں ۱۰۰۳۷ (دس ہزار، سنتیس) چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بولیوں کی تعداد استعداد سے کئی گُنا زیادہ ہے۔ قدیم ترین بولیوں میں چینی، یونانی، ہسپینی، سنسکرت اور عربی شامل ہیں۔ جانوروں کی جو بولیاں ہم دن میں کئی مرتبہ سُنتے ہیں، اُن میں مُرغے، بُلبل، کوّے، کبوتر، مور اور کوئل کی بولیاں شامل ہیں۔

دیمک، مچھر اور مکھیوں کی بولیوں سے بھی دنیا کا ہر فرد آشنا ہے۔ طوطوں اور فصلی بٹیروں کی بولیاں بھی کانوں کو اچھی لگتی ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ جانداروں کے ہر گروہ یا جماعت کی بولی، ثوری اور معنوی اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور بولی ہر ذی روح کی شناخت سمجھی جاتی ہے، جس سے جاندار کی انفرادیت اور تشخص کا تیقّن کیا جاتا ہے۔

''کیوں نہ جنّت کو جہنّم میں ملالیں یارب''

جنّت اور جہنّم نہ صرف لازم وملزوم ہیں، بلکہ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ یہ صوری اور معنوی اعتبار سے ایک دوسرے کی اضداد ہیں اور ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں ہر حیوانِ ناطق (بشرطیکہ اُس کا دماغی توازن صحیح ہو) بلا مذہب وملت، رنگ ونسل وجنس،کوان دونوں مقامات پر پورا ایمان ہے۔.....وہ نوری ہو یا ناری، ان دونوں مقامات میں سے اُسے صرف ایک ہی مل سکتا ہے، تحفے کے طور پر تو دوسرا سزا کے طور پر۔ اس لئے ہر انسان اول الذکر کا خواہش مند یا آرزومند ہوتا ہے ۔یہ الگ سوال ہے کہ انسان کو ضروری نہیں کہ اُسے ہر وہ شی مل جائے، جس کی وہ خواہشیں رکھتا ہو......ایک مقولہ ہے کہ اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں تو ہر بھکاری اُن پر چڑھ بیٹھتا۔

بقولِ غالبؔ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے رمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جیسے حقوق اور فرائض کو پولیٹکل سائنس والوں نے ایک ہی سکے کے دو پانسے لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے، کہ محنت کے بغیر معاوضہ نہیں ملتا۔ یا فرائض کو بھلا کر یا نظر انداز کر کے حقوق کا تقاضہ نہیں کیا جا تا سکتا، بالکل اسی طرح جنّت میں داخلے کے لئے "خالق" نے جو شرائط متعین کی ہیں، انہیں پسِ پشت ڈال کر اس کی خواہش کرنا کچھ ایسا ہی ہے، جیسے کوئی سورج کو آسمان سے اُتار کے اپنے گھر کو روشن کرنے کی کوشش کرے۔

انسان نے دنیا کو جنّت بنانے کے کئے کتنے جتن کئے، لیکن پھر بھی اس کے من سے اُس اَن دیکھی جنّت کی خواہش نہ گئی...... جو بظاہر اُس کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ لیکن اس کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی سُن رکھا ہے، اس سے اس کے دل میں تجسس کا احساس ہمیشہ بڑھتا رہا ہے۔ دوسری طرف اسے دوزخ کا کھٹکا لگا رہتا ہے، جس کا تصور کرتے ہی اُس کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی بھولے سے اس کی انگلی کسی دہکتے ہوئے انگارے سے چھو جائے تو اس کی جلن اور سوزش سے وہ کتنا تڑپ اُٹھتا ہے۔ دونوں مقامات کی حقیقت جاننے کے بعد جنّت کے متمنی نیک لوگوں کو بھی کبھی کبھی غیر شعوری طور پر جنّت کا احساس ہوتے ہی کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس تحفے کے حصول کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کے لئے مرنا ضروری ہے مگر مرنا کوئی نہیں چاہتا........ مرنے کی تمنا کرنا یا خودکشی کرنے کا خیال تک دل میں پیدا کرنا خالق کو پسند نہیں۔ انسان کتنی ہی طاقت اور غرور کا حامل کیوں نہ ہو...... زندگی اور موت پر اُسے قدرت حاسل نہیں۔ بقولِ اقبال۔

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ہاں یہ بھی کسی حد تک سچ ہے کہ جنّت اور جہنّم اشرف المخلوقات کے اپنے ہاتھ

میں ہیں جو اُسے اپنی صوابدید پر مل سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود مختار ہے اور زندگی کو وہ اپنے ''اعمال'' سے جنّت اور جہنّم عطا کرا سکتا ہے، لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے اور ہمیشہ ہاتھ اُٹھا کر رب کریم سے جنّت کی مانگ کرنے کا عادی بن گیا ہے اور جہنّم سے پناہ مانگتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنا محاسبہ کرے تو وہ ہرگز ہرگز وہ چیز نہ مانگے گا، جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب میں ان دونوں کا تصور ان کی ظاہری و معنوی صورتوں میں موجود ہے۔ ہر اُس شخص کے لئے جنّت کی دعا کی جاتی ہے، جو رحلت کر جائے یا پھر بعض حضرات موت کے لئے پیشن گوئی بھی کر ڈالتے ہیں۔ مرنے والے سے ہمدردی جتائے ہوئے کہتے ہیں کہ مرحوم جنّتی یا بہشتی تھا۔ اس کے معلوم کارناموں کی روشنی میں اس کے حقوق الٰہی اور حقوق العباد کی پاسداری کو زیر نظر رکھ کر یا پھر اس کی موت کا سبب، ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان کے حساب سے اس کی اگلی دنیا کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان جمعہ، شبِ قدر، شبِ برات، یا میلاد النبی ﷺ کے دن یا پھر حجِ بیت اللہ (حرمین) کے دوران یا اُن مقدس مقامات پر قیام کے دوران رحلت کر جائے تو سب یہی کہتے ہیں کہ مرحوم کو جنّت نصیب ہوئی۔ جہاد فی سبیل اللہ میں اگر کوئی شہید ہو جائے تو اُس کو جنّت کی سند حاصل ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنّت ماں کے قدموں میں ڈھونڈو...... یا کوئی شخص کوئی ایسی نیکی کا کام کرتے وقت فوت ہو جائے... یا پھر کم سنی میں مر جائے، اس کی عدم کی زندگی کے بارے میں پیشن گوئی کرنا یا گارنٹی دینا مناسب نہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بُت خانے میں کافر کو گاڑو آ کے کعبے میں

اگر ملت کا کوئی فرد کسی عبادت گاہ یا فرد کے گھر کا تالا توڑتا ہوا یا نقب زنی کرتا ہوا

مرجائے تو اُس کے لئے ظرفِ مکان کوئی Criteria نہیں ہوگا۔ بہر کیف اگر نیکی کے ساتھ بدی، اندھیرے کے ساتھ اُجالا...... گناہ کے ساتھ ثواب نہ ہو تو زندگی بد مزہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انسان نہ تو متحرک ہوگا نہ اُس میں جستجو کی رمق ہوگی........ نہ خوف نہ ڈر........ اور نہ کوئی اپنے مالک کے آگے میٹھے پھل کے حصول کے لئے گڑگڑائے گا۔ اگر آسانی کے ساتھ یہ منزل یا مقام دستیاب ہو جائے تو اس کی قدر لوگوں کو بہت کم ہوتی ہے، کیونکہ گھر کی مُرغی دال برابر مانی جاتی ہے۔ شاعر تو اس حدّ تک بڑھ گیا کہ وہ بیساختہ بول اُٹھا ؎

کیوں نہ جنّت کو جہنّم میں ملائیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

حکیم صاحب کی ''الحیات''
سے سکندر کے ''آبِ حیات'' تک

حکیم صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کی ایجاد کردہ دوائی ''الحیات'' ...... ''آبِ حیات'' سے سستی ہے، کیونکہ اس کے مطب تک رسائی بہت آسان ہے۔ ٹانگے میں آیئے یا بیل گاڑی پر یا سائیکل پر اور دوائی اتنی سستی ہے کہ اس کی قیمت ادا کرنے سے آپ اپنی جبین کبھی ہلکی محسوس نہیں کریں گے۔

دس دن تک روزانہ بعد از نمازِ عشاء دو چمچ پی لیں تو عمر میں اضافہ یقینی ہے۔'' ...... ''آپ کے حساب سے عمر میں کتنے سال کا اضافہ ہوسکتا ہے''؟۔ایک شخص نے پوچھا۔ مثلاً فرض کرتے ہیں کہ آپ اس وقت ۸۰ سال کے پیٹے میں ہیں، ''الحیات'' کھانے سے آپ کو مزید ۸۰ سال کی گارنٹی مل سکتی ہے، یعنی آپ ۱۶۰ سال کے ہوجائیں گے۔ یعنی سوفی صد اضافہ...... پھر کیا ہوگا''!...... ''پھر'' ...... ''پھر وہی ہوگا۔ یعنی کہ آپ کی وفاتِ حسرت آیات وقوع پزیر ہوگی...... اور کیا!''

"حکیم صاحب اگر مرنا ہی ہے تو عمر میں اضافے کا کیا فائدہ۔ کم عمر میں مریں یا سو ۱۰۰ سال بعد........ مرنا تو بہر حال ہے۔ اور بوسیدہ اور گل سڑ کر مرنے سے اچھا ہے کہ تازہ دم اور چلتے پھرتے، کھاتے پیتے مریں........ "الحیات" سے تو مجھے سکندر کی آبِ حیات یاد آرہی ہے"

سکندر اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ..... ہفت اقلیم پر اُس کا راج تھا۔ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کوہ قاف میں بھی اس کی حکومت تھی۔ ایک مقام جسے آج بھی سدِ سکندری کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے آگے جانا سخت منع کر دیا گیا ہے۔ بھلا وہاں ایسی کون سی بات ہے کہ ایک بہت بڑی دیوار چُن دی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری کے آگے ایک غار تھی، جس میں کافی اندر جا کر ایک چشمہ ملتا تھا۔ اس چشمے کا پانی جہاں سے نکلتا تھا، اُسی جگہ پھر واپس زیرِ زمین میں غائب ہو جاتا ہے۔ دراصل یہی وہ چشمہ تھا، جس میں آبِ حیات ہوتا تھا۔ جس نے ایک مرتبہ آبِ حیات کا ایک گھونٹ پی لیا، سمجھو وہ امر ہو گیا۔ وہ کبھی نہیں مرتا تھا" اس چشمے کا پتہ سکندر کو تب چلا، جب وہ ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر رہا تھا۔ کشتی چلانے والے سے سکندر سے پوچھا "تم یہ کشتی کب سے چلا رہے ہو"؟........ "مجھے کچھ علم نہیں۔ ظہورِ آدم یا وجودِ آدم سے ہی یہ بتایا گیا کہ میں جب سے پیدا ہوا........ زندہ ہوں........ اور تا حیات زندہ رہوں گا"۔

"کہیں تم خضر تو نہیں، جو پانیوں کا پیغمبر ہے؟"

"ہاں میں وہی خضر ہوں"۔

کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ لمبی عمر کیسے مل سکتی ہے"؟........ "ہاں........ قطبِ شمالی سے دو ہزار میل جنوب کی طرف جو پہاڑ ہیں، اُن میں ایک غار ہے۔ غار کے اندر ایک چشمہ ہے۔ اُس کا پانی پینے سے تم کبھی نہیں مر سکتے"........ "ٹھیک ہے، شکریہ تمہارا۔.....

میں ضرور اُس چشمے تک پہنچوں گا اور پانی پی کر رہوں گا۔ تاکہ رہتی دنیا تک سات جہانوں پر میری حکومت قائم رہے"۔

اس کے بعد سکندر اُس چشمے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن وہ خضر کی نصیحت کے مطابق اکیلا ہی غار میں گیا۔ خضر نے اُسے ہدایت کی تھی کہ اپنے سوا کسی اور کو اس چشمے کا پانی نہ پینے دینا۔ کیونکہ اس طرح اُس کے اور دشمن پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی لالچی اُسے پانی نہ پینے دے اور مار ڈالے۔ تاکہ اس کی حکومت قیامت تک قائم رہے۔

سکندر نے کانچ کی ایک بوتل میں پانی بھرا۔ ارادہ کیا کہ وہ غار سے باہر آکر پانی پیئے گا۔ تھوڑا سا پانی اہلیہ کے لئے بھی بچا کے رکھا۔ بادشاہ کی سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی تھی کہ گپھا کے اندر اور باہر عجیب وغریب آوازیں آرہی تھیں، جیسے کہ کوئی رو رہا ہو اور واویلا کر رہا ہو۔ ہائے وائے، وغیرہ انسانوں کی آوازیں .... اچانک اس کا پاؤں مٹی کے ایک ڈھیلے سے ٹکرا گیا اور اس میں سے آواز آئی "ہائے میرے خدا! ان ٹھوکروں سے بچا" سکندر ڈر گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ غار کے ہر طرف مٹی کے ڈھیر اور بُت ہیں، جن سے دردناک آوازیں آرہی ہیں۔ جس مٹی کے ڈھیلے سے اُس کا پاؤں ٹکرا گیا تھا، اُس میں سے آواز آئی۔ "اے لالچی نادان بادشاہ! کیا تم جانتے ہو کہ یہ ڈھیلا کیا ہے؟ یہ میرا سر ہے۔ اور میں بھی کسی زمانے میں اسی ہفت اقلیم کا بادشاہ بلا شرکتِ غیرے تھا۔ میں نے بھی ایسی ہی غلطی کی کہ لالچ میں آکر آبِ حیات کا ایک گھونٹ پی ڈالا۔ میں واقعی مرا نہیں، لیکن میرا جسم مٹی بن چکا ہے اور روح زندہ ہے۔ میں سخت عذاب میں ہوں۔ خدا سے مانگتا ہوں کہ میری روح اس مٹی سے آزاد کرے۔ مجھے صحیح معنوں میں وہ موت آجائے جو ہر ذی روح کو آتی ہے۔ میرے جیسے

یہاں ہزاروں اور بھی مٹی کے ڈھیر ہیں۔اے نادان انسان! تیرا بھی یہی حال ہوگا۔نہ تم مروگے، نہ جیوگے، مسلسل عذاب میں مبتلا رہوگے۔یہ پانی نہ پینا۔پھر پچھتاؤگے۔مرنا ضروری ہے اور مرنے سے سکون اور راحت نصیب ہوتی ہے"۔

سکندر نے دو چار قدم اور بڑھائے تو سخت دردناک آوازوں سے اُس کا دل دہل گیا۔اُس نے بوتل اُٹھا لی اور زمین پر پٹک دی۔کانچ کی بوتل کے ٹکڑے ہو گئے۔پانی بہہ نکلا اور زمین پر بہتے ہی غائب ہوگیا۔دو چار قطرے زمین کے اوپر رہ گئے۔اس دوران ایک پیاسا کوّا کہیں سے اُڑتا ہوا آیا۔اور چونچ ان قطروں پر ماری۔یہ قطرے کوّے کی چونچ کو بمشکل چھو سکے۔کہتے ہیں کہ یہ کوّا جب مرا تو اُس کا جسم مٹی میں تبدیل ہوگیا، ماسوائے اس کی چونچ کے............کہتے ہیں کوّے کی چونچ کبھی نہیں سڑے گی، کیونکہ اس نے آبِ حیات کو چھولیا ہے۔

مکھی

علوم الحیوانات اور حشرات الارض کے ماہرین اور محققین کا خیال ہے کہ دنیا میں ''مکھی'' کا ظہور اُسی دن ہوا، جس دن باوا آدم نے اس دھرتی پر پہلی مرتبہ قدم رنجہ فرمایا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ''مکھی'' حضرت آدم کے ساتھ اسی جنّت سے تشریف لائی، بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذاتِ گرامی ہماری ابدی اور ازلی ساتھی ہے۔

''مکھی'' کو مونث کے جنس میں استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ دنیا کی ہر زبان میں اسے مادہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور اسمِ صوت کے اعتبار سے بھی یہ ایک نسوانی کردار کی حامل ہے۔ دوسرے کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں کی طرح اس کی جنس طے کرنا ناممکن ہے۔ اُڑنے والے طیور میں کوّے، طوطے، چیل، ہُد ہُد، بلبل اور شاہین کی جنسی شناخت کسی بھی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ مچھر حالانکہ دونوں مخالف جنسوں میں پایا جاتا ہے، مگر پھر بھی اسے مذکر یا نر کے طور پر ہی لیا جاتا ہے۔ اور اگر ''مکھی'' نر بھی ہو تب بھی اسے ''صنفِ نازک'' ہی سمجھا جاتا ہے۔ آس پاس کہیں بھی یہ بھنبھناتی یا بھنبھناتا ہو، تو اسے نہ کوئی ''ملکۂ ترنم'' کہتا ہے اور نہ ''شہنشاہِ غزل''.........دونوں صورتوں میں اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔

''مکھی''، خواہ کسی غریب ملک کی ہو یا خوشحال اور ترقی یافتہ ملک کی، وہ اپنی جبلت، خصلت اور عادت کے لئے یکساں پہچان رکھتی ہے۔ غلاظت اور کثافت اس کی شناخت اور اس کی زندگی کی مختصر کہانی کے عنوانات ہوتے ہیں۔ کثافت یا غلاظت کے ذمہ دار مہذب انسان اس سے نفرت کرتے ہیں۔

کتابوں میں جب جب کبھی مکھی کا ذکر آیا تو کسی نہ کسی دلچسپ حوالے سے۔ ابراہیم نے آزر کے تراشے ہوئے پتھر کے معبود کی ناک توڑ کر معصومیت سے کہا کہ ''جناب خدا کی ناک پر ہیں''۔ ''مکھی'' کو ناک پر بیٹھے ہوئے برداشت نہ کر سکا اور میں نے اس مکھی پر ہتھوڑے سے حملہ کیا، لیکن مکھی اُڑ گئی اور بچ گئی''۔ .... مختصراً خدا کی ناک ٹوٹ گئی۔ جس کے بعد میری آنکھ کھلی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو ''خدا'' اپنی ناک پر سے مکھی نہ اُڑا سکنے کا اہل ہو، وہ اس ساری دنیا کو اور آپ کو کیسے بنا سکتا ہے، کھلا سکتا ہے۔ اسی طرح سے ایک ''مکھی'' نے ابنِ آدم کو بُت پرست کے بیٹے سے پیغمبر بنا دیا۔ حالانکہ اس میں مشیت ایزدی یہی تھی، مکھی ایک بہانہ بنی۔ اس کے علاوہ مکھی کا کوئی کارنامہ پڑھنے سُننے کو نہ ملا۔ البتہ یورپی لٹریچر میں ''نقاد'' یا نکتہ چینی میں مکھی کے حوالے سے ایک واضح فرق کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ایک کتاب میں پڑھا کہ تنقید کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ تنقید کرنے والا جو کسی انسان یا چیز کی خوبی اور خامی دونوں کا معترف ہو اور اس سے تنقید کو مثبت اور تنقیص کو منفی سوچ سے تعبیر کیا یا ہے۔ اس طرح ناقد کو مکھی سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ہر انسان کے جسم کے صاف حصے پر کبھی نہیں بیٹھتی بلکہ اُسی جگہ جا کر بیٹھ جاتی ہے، جو جگہ نسبتاً نا صاف یا گندی ہو۔ اسی طرح ناقد خوبی کو نظر انداز کر کے صرف خامی کو اُچھالتا ہے۔ ایک مغرور، خود پسند اور ذہنی طور پر دیوالیہ انسان کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''فلان'' شخص اپنی ناک پر مکھی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔

کسی ویران سنسان اور غیر آباد جگہ کے بارے میں کہتے ہوئے سُنا گیا کہ "جب ہم وہاں پہنچے، وہاں مکھی بھی نظر نہ آئی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مکھی ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ مقدس عبادت گاہوں، مقبرہ ہو یا شمشان، حلوائی کی دکان ہو یا قصائی کی، نان بائی کی دکان ہو یا نائی کی، تاج محل ہو یا لال قلعہ، تھانہ ہو یا سپریم کورٹ، کسی سیاسی پارٹی کا دفتر ہو یا راشٹر پتی بھون........ مکھی آپ کو ہر جگہ ملے گی۔ سیاسی جماعتوں کے دفاتر میں اس کی تعداد نسبتاً سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے سیاسی جماعتوں کے لیڈر ایک دوسرے کو گٹر کی اولاد، یا بیت الخلاء کی مکھیاں کہتے رہتے ہیں۔ اردو کی ایک اصطلاح ہے "مکھی چوس"...... یہ گرامر کے حساب سے اسمِ صفت ہے اور انتہائی درجے کے کنجوس کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے پس منظر میں ایک کہاوت ہے۔ کہ ایک، کنجوس بُنیا گھی تول رہا تھا۔ اچانک اس پر ایک مکھی آکر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ مکھی اپنے آپ کو آزاد کر کے اس دلدل سے نکل کر اُڑ جاتی، کنجوس نے سمجھا کہ یہ دوسرے بنئے کی ایجنٹ ہے اور اسے اُس نے بھیجا ہے، کہ یہ اپنے جسم کے ساتھ گھی لگا کر دوسرے بنئے کے برتن میں ڈال دے۔ اس لئے اُس نے مکھی کو منہ میں ڈال کر اس کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی چکنائی کو تو وہ الگ نہیں کر سکتا، البتہ گھی چوس کر پھینک دیا۔

مکھیوں پر سب سے زیادہ ریسرچ کا کام چین میں ہے۔ کیونکہ مینڈک، چیونٹی، بچھو، سانپ، نیولا، ٹڈی، کھٹمل، اور برساتی کیکیڑوں کے علاوہ مکھی، چوہا اُن کا من بھاتا کھاجا ہے۔ چینی مکھیوں کو جال میں پکڑ کر پھر سکھاتے ہیں۔ پھر کڑھائی میں فرائی کر کے چائے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہندستان کے صوبۂ آسام، ناگالینڈ، سِکم، اور مغربی بنگال میں بھی مکھیوں کو پکڑ کر دھاگے میں سوئی سے پرو کر اُن کی مالائیں بنا کر، سکھا کر، تل کر کھایا جاتا ہے۔ لیکن چین منگولیا کوریائی ریاستوں اور برما میں بھی

مکھیوں کی بھی تجارت ہوتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایک مکھی دن میں ۹۰۰ سو انڈے دیتی ہے۔ اور چوبیس گھنٹوں کے اندر ان انڈوں سے مکھیاں جنم لیتی ہیں۔ اور دس دن کے بعد یہ مکھیاں بھی انڈے دینا شروع کر دیتی ہیں۔ اس طرح مکھیوں کی تعداد انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کی عمر ایک ماہ یا دو مہینے ہوتی ہے۔ انہیں دوسرے کیڑے اور پتنگے کھا جاتے ہیں۔ مینائیں، کبوتر، چڑیاں، مچھلیاں، نیولے، سانپ، مینڈک، مکڑے وغیرہ ان کا شکار کرتے ہیں۔ مکھی انسان اور حیوان کی طرح جسمانی طور پر چھوٹی، توانا، نحیف، لحیم و شحیم اور تونگر ہوتی ہیں۔ اگر کوئی موٹی تازی مکھی نظر آجائے تو لوگ اُسے "مکھا" کہتے ہیں۔ خواہ اُس کی جنس کچھ بھی ہو۔ ماہرین کی تحقیق کے مطابق ان میں بھی حاکم اور حکام ہوتے ہیں۔ مکھیوں کے سردار کو "رانی" کہتے ہیں، خواہ وہ نر ہو یا مادہ۔ طبی ماہرین نے مکھیوں کو درجنوں بیماریوں کی وجہ بتایا، ان میں ہیضہ، ہیپی ٹائٹس جیسے موذی امراض بھی ہیں۔ بنیادی طور سے ان بیماریوں کے ذمہ دار "آدمی" لوگ ہیں۔ صاف پانی میں گندگی میں فضلہ ملا کر اپنا دشمن بنا دیتے ہیں اور اس کی ذمہ داری مکھیوں پر ڈالتے ہیں۔ شہد جیسی میٹھی نعمت کو بنانے والی بھی ایک مکھی ہوتی ہے۔ جو عام مکھیوں سے کچھ مختلف ہوتی ہے۔ شکل وصورت میں نہیں، بلکہ خصائل سے....... دنیا میں اگر خدا نے کسی کی "قے" کو کھانے کی اجازت دی ہے اور اسے نعمت اور شفا کرنیوالی دوا کا درجہ دیا ہے تو وہ شہد کی مکھی ہے۔ جس کی "قے" کو ہم شہد کہتے ہیں۔ گلہائے رنگارنگ اور بوٹیوں کا رس چوس کر شہد کی مکھی لا کر اپنے چھتے کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں "اُلٹی" کر کے جمع کرتی ہے۔ جسے سب شہد کہتے ہیں۔

کاش اس مکھی کے لئے کوئی اور نام تجویز کیا جاتا!۔

نازن

آپ نے لفظ نامرد بارہا سُنا ہوگا، لیکن نازن، ناعورت، نا مستورات جیسے الفاظ جو عام طور پر مستعمل نہیں یا تو سُنے ہی نہیں ہوں گے یا پھر بہت کم سُنے ہوں گے۔ ہمارے یہاں ایسی بہت سی خواتین کی کمی نہیں جو یوں تو بظاہر صنفِ نازک کے زمرے یں شمار ہوتی ہیں۔ اُن کے خدّ وخال، عشوے وغمزے وادائیں، آواز ودیگر خصائل عورتوں جیسے ہوتے ہیں، لیکن اُن کے حوصلے، عزائم، غیرت، ہمت وحمیت بعض اوقات دیکھ کر انسان کی عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ جب کوئی بزرگ یا حق پرست شخص ایسی خواتین کا حوالہ دیتا ہے یا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ''کون کہتا ہے، کہ وہ عورت ہے، وہ تو شیرِ مرد ہے، یا مرد سے بڑھ کر ہے۔'' یہ الفاظ اُس خاتون کی تذلیل یا توہین کے لئے بولے نہیں جاتے، بلکہ یہ تو سچے دل سے توصیفی کلمات ہوتے ہیں، جو اُس کی جوانمردی اور استقلال کے اعتراف کے طور پر اُس کے لئے ادا کئے جاتے ہیں۔ اس میں ہرگز کوئی طنز یا طعنہ نہیں ہوتا۔ دراصل بہادری، ہمت، مستقل مزاجی، حوصلہ مندی، عزمِ صمیم اور نڈرپن ضروری نہیں کہ کسی مرد کی جاگیر ہو۔ یہ خصائل عورتوں میں بھی پائے گئے ہیں۔ جس طرح اُس مرد کو جو بچہ پیدا نہ کر سکتا ہو، جسم میں مضبوط جینز اور infernity نہ ہو، اکثر اُسے نامرد کہتے ہیں کچھ

لوگ اُنہیں ہیجڑے اور مخنّث بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ مخنّث اور نامرد میں اتنا فرق ہے، جتنا کہ عورت اور مرد میں۔ کوئی مرد اگر باپ نہیں بن سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نامرد ہے۔ وہ برابر مرد ہوتا ہے۔ اُس میں بہت حوصلہ، بہادری، عزم اور مردانہ خصائل برابر ہوتے ہیں۔ صرف بچہ پیدا نہ کرسکنے J eens کی کمی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ایک عورت جو بانجھ ہوتی ہے، اُس کے اندر بھی ایسی Fortainity کی کمی ہوتی ہے۔ لیکن اُسے ناعورت نہیں کہا جاسکتا۔ ''دراصل نازن'' عورت اور مرد کے درمیان کی کسی کیفیت کا نام ہے۔ یعنی نازن، نہ مرد ہو نہ عورت...... بلکہ دونوں ہوں یا پھر دونوں بننے کی کوشش کررہے ہوں۔ شعوری طور پر یا غیر شعوری سے ......فیشن یا کریزی نیس Crrazynrss کی وجہ سے۔ آپ نے ایسے ''مردوں'' کو تو ضرور دیکھا ہوگا، جو عورتوں کی طرح نہ صرف بال لمبے رکھتے ہیں، بلکہ بالوں کی چوٹی بھی بنالیتے ہیں اور اُنہیں کسی دھاگے یا سکارپ سے ایک مشرقی عورت کی طرح باندھ بھی لیتے ہیں یا پروندہ باندھ کر شانوں پر ڈال کر پیچھے۔ سے آنے والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ کچھ ''مرد'' رنگین لباس پسند کرتے ہیں۔ یہ نامرد یا مخنّث نہیں ہوتے، بلکہ ایسا وہ فیشن کے لئے کرتے ہیں یا پھر آپ اُنہیں ''خبطی'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی چوتھی یا پچویں دہائیوں میں جب ہندوستان سے بہت سے نوجوان حصولِ تعلیم یا کسی اور کام کے لئے مغربی ممالک میں جانے لگے تو وہاں کی طرزِ زندگی اور ثقافت نے اُنہیں متاثر کئے بغیر نہ رکھا۔ بہت سی طالبات جب واپس فارغ التحصیل ہوکر وطن واپس لوٹیں تو اُن کے سر پر مختصر بال دیکھ کر اُن کے خاندان کے لوگوں کو صدمہ ہوا، لیکن اُن کی تعداد اتنی کم تھی کہ دوسری مشرقی خواتین پر اُس کا کوئی اثر نہ پڑا، بلکہ جس نے بھی اُنہیں دیکھا، تو اُن سے یا تو پردہ کیا یا نفرت سے نظریں

دوسری طرف موڑ لیں۔ رفتہ رفتہ مغربی کلچر کی یلغار نے ''مستورات'' کے ایک کھیپ کو'' نا مستورات'' بنا ڈالا۔ مردوں جیسا لباس، مردوں جیسے بال، ہونٹوں میں سگریٹ دیکھ کر اُنہیں کوئی ''مرد'' نہیں کہتا، بلکہ نازن یا نامستورات کہنے لگے۔ اس موضوع پر اردو شاعر امین حزین نے نومبر ۱۹۴۵ء کے ماہنامہ ''ساقی'' میں ایک نظم شائع کی، جس کا عنوان تھا ''نامستورات'' سے چند گزارشات.........اُس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اے جذب وکشش کے آستانے عنقائے ستوں کے آشیانے!
فطرت کے حسیں تریں کرشمے! اے قلزمِ زندگی کے چشمے!
مردوں کا فریب کھا گئی تو
جھانسے میں مردوں کے آگئی تو
خوش ہیں کہ ہوئی ہے عورت آزاد اب داد ہے اس کی نہ فریاد
نازن ہوئی ہے تُو جب سے ناداں روتا ہے تجھے وقارِ نسواں
مغرب کا چھڑک کے رُخ پہ غازہ
غیرت کا نکال کر جنازہ
تُو آلۂ کار بن گئی ہے رنگینِ بہار بن گئی ہے
زینہ ہوں توقعات کا میں تحفہ ہوں شبِ برات کا میں
مردوں کا فریب کھا گئی تو
جھانسے میں مردوں کے آگئی تو

اس سے پہلے اکبر آبادی نے اس غیر فطری بدلاؤ سے پیدا شدہ خطرے کی گھنٹی بجا کر ''زن'' اور اُس کے ''مرد'' تک پیغام پہنچا دیا تھا کہ مستقبل میں آدم اور حوا میں فرق

کرنا مشکل ہو جائے گا۔ابو اور امی کی پہچان ختم ہو جائے گی۔ پردہ ایک الگ بات ہے، لیکن اپنی جنس بدلنا یا مخالف جنس کی نقل کرنا بے پردگی سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔

معروف ادیب فکر تونسوی نے اپنے کالم ''پیاز کے چھلکے'' میں لکھا تھا۔ کہ دہلی کی کسی تقریب میں خواتین و حضرات سب موجود تھے۔ایک صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا ''بھائی صاحب ذرا یہ اخبار دیجئے گا'' اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک ''نازن'' نے کہا۔ ''یہ بھائی صاحب نہیں، میری بیٹی ہے۔آپ کو اتنی بھی پہچان نہیں'' اُس شخص نے پھر کہا۔ ''معاف کیجئے بہن جی! میں سمجھا تھا یہ بھائی صاحب ہیں''۔ بہن جی نے پھر اُس کی طرف گھور کر دیکھا ''میں بہن جی نہیں، اس لڑکی کا باپ ہوں'' اُس نے غصے سے کہا۔

مرد کتنا بہادر ہو اور مردانہ پن کا مالک ہو جب وہ ''نسوانی'' اطوار اختیار کرتا ہے تو اُس کے اندر کا مرد اُتنا ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ۷ ماہ کی حاملہ خاتون ہو۔خاتون کتنا بھی مرد بننے کی کوشش کرے اور آزاد اور خود مختار بن جانے کی کوشش کیوں نہ کرے، جب اُس کے ماں بننے میں صرف دو ماہ باقی رہ جاتے ہیں یعنی سات ماہ کی حالتِ حمل میں ہوتی ہے، تو نہ صرف عقیدہ بلکہ ڈاکٹروں کے اصولوں کے مطابق بھی اُسے کوئی بھاری کام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ آرام کرنا ضروری ہے۔اُس کے لئے وقت گزارنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہ کوئی اخلاقی موضوع پر لکھی گئی کتاب کا مطالعہ کرے، یا اگر ناخواندہ ہے تو اپنے ہونے والے بچے کے لئے بنیان، موزے اور ٹوپی بُنے۔وہ اس سٹیج پر ''نازن'' یا نقلی مردنہ بنے۔

دنیا کی جتنی مشہور خواتین گزری ہیں، جنہوں نے بہادری، اور ہمت میں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ایک مقام پر مرد پر انحصار ہونا پڑتا تھا۔اپنی قابلیت، خدا

داد صلاحیت اور فطرت پسندی نے عورت کو مردوں سے بھی اونچا مقام عطا کیا۔لیکن ایسی خواتین نے ''نازن'' کی شکل اختیار نہیں کی، بلکہ وہ زن ہی رہیں۔ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ وایلزبتھ، ہندوستان کی موجودہ صدر جمہوریہ پرتبھا سنگھ پاٹل، وزیر اعظم اندرا گاندھی، پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو، شری لنکا کی صدر بندرانائیکے، بنگلہ دیش کی دو وزیر اعظم شیخ حسینہ اور خالدہ ضیاء، اسرائیل کی وزیر اعظم اور معلوم دور کی ایسی کئی خواتین آج کی تاریخ میں بھی عورت کے روپ ہی میں دنیا کی پاورفل قوموں کی رہنمائی کررہی ہیں۔ملکۂ نور جہان، بیگم حضرت محل، چاند بی بی، لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) فلسطین کی خالدہ اور ہواباز کلپنا چاولہ، نوبل انعام یافتہ مدر ٹریسا ایسی خواتین ہیں، جو واقعی عورتیں ہونے کے باوجود ''نازن'' نہیں، لیکن پھر بھی مرد نہ تھیں۔عورت اگر اپنے ہی حصار میں قید بھی رہے تب بھی وہ چاہئے تو ایسے کام سرانجام دے سکتی ہے، کہ جو مردوں کے بس کی بات نہ ہوں۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذات طاقت اور صلاحیت کو پہچانے۔ اگر وہ پرتبھا پاٹل نہیں بن سکتی، مگر اے، پی، جے، عبدا کلام کی والدہ تو بن سکتی ہے۔ اگر وہ ملکہ ایلزبتھ یا ہیلری کلنگٹن نہیں بن سکتی تو بارک اوبامہ کی ماں تو بن سکتی ہے۔ اگر وہ مدر ٹریسا نہیں بن سکتی تو جس ماں نے ٹریسا کو جنم دیا وہ تو بن سکتی ہے۔ کچھ نہیں تو وہ 'عظیم ماں' تو بن سکتی ہے۔

گرم دَل، نرم دَل، دھرم دَل، بے شرم دَل

(ہندی زبان میں دَل سے مراف گروہ ہے)

ریاست جموں و کشمیر حقیقی کنٹرول لائن کے آر پار عالمی نقشے پر موجود واحد خطۂ اراضی ہے، جہاں کا ہر باشندہ مذہب و ملت، رنگ و نسل عمر و جنس اور نسل و ذات و زبان کسی نہ کسی دَل سے جُڑا ہوا ہے۔ نہ صرف جڑا ہوا ہے، بلکہ سیاست دان ہے اور سیاست ہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ گھر ہو یا بازار، مسجد ہو یا خانقاہ، مدرسہ ہو یا سرکاری دفتر، کھیت کھیان ہوں یا قبرستان، شمشان ہو یا نائی، قصائی یا حلوائی یا ہو دُکان نانبائی کی، شادی ہو یا غمی، ڈولی اُٹھانے یا دُلہا کو گھوڑی پر چڑھانے کا خوش گوار لمحہ......... یا میّت کا جنازہ اُٹھانے کا حزن والم کا غمناک موقعہ...... سیاست وہاں بھی ایکٹیو دیکھی جاسکتی ہے۔ گھر کے اندر رسوئی میں جو سیاست پائی جاتی ہے، اُس کا ذائقہ پکوانوں کو بھی متاثر کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں گھر کا مالک اور مالکن کے بیچ میں تناؤ اور کھٹاس پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کا اثر پورے گھر اور خاندان پر پڑنا لازمی ہے۔ گھر سے نکل کر گھر، محلے، گاؤں اور ملک پر بھی بسا اوقات...... یہی رسولی سیاست اثر ہوتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ اس کی زندہ مثال اُن سیاسی خاندانوں سے دی جاسکتی ہے، جو کئی حصوں میں منقسم ہو گئے ہیں اور ہر حصہ اپنی الگ الگ سیاسی پارٹی بنا کر لوگوں کو بیوقوف بنا رہا ہے۔ بنیادی طور پر جماعت

ایک ہی ہے، لیکن اس کے آگے اے، بی، سی، ڈی کے لاحقوں کا استعمال کر کے بظاہر اپنی الگ شناخت اور انفرادیت ظاہر کرنے کی لاحاصل سعی کرتا ہے........ اگرچہ وہ ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہوتے ہیں۔ کھیتوں، کھلیانوں اور کارخانوں کی سیاست ٹریڈ یونینوں کے پروگراموں میں منعکس ہوتی ہے۔ مذہبی اور نظریاتی تنظیموں کی سیاست، عبادت گاہوں، درس گاہوں، مکتبوں، بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے آستانوں اور مقبروں پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح ظرفِ مکان سے جُڑی ہوئی سیاست کا مزاج اچھے اور بُرے واقعے سے جڑا رہتا ہے۔ مثلاً آفاتِ سماوی یا قہرِ الٰہی (آندھی، طوفان، سیلاب، زلزلہ، خشک سالی، وبائی بیماریاں وغیرہ) سے جُڑی ہوئی سیاست، ہواؤں اور دریاؤں کا رُخ بدلنے کی کوشش میں پنہاں سیاست، خارجی اور عالمی معاملات میں اُلجھنے کی سیاست، سادہ لوح عوام پر شعبدہ باز اور مداری کے کھیل کا حظ اُٹھانے کے لئے ان بازیگروں کی مجلسوں میں اپنا قیمتی وقت بخوشی ضائع کرنے میں کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب ہر جگہ سیاست قابض ہے پھر جائیں تو جائیں کہاں! ہر خورد ہ کلاں دہرے معیار میں لتھڑا ہوا پیار و محبت، مہر، خلوص، دوستی، دشمنی، عداوت، تہذیب، ثقافت، سخاوت، حلاوت، سیادت، امامت، بغاوت ہر چیز میں دہرا معیار اور بدترین بیوروکریسی... آج مُرغا حلال تو کل حرام، آج کوّا حرام اور کل حلال.... حلال کو حرام... اور حرام کو حلال قرار دینے کی حمایت میں فلسفیانہ اور عالمانہ، تاویلات، دلچسپ دلائل، اور یہ بڑی تیزی اور خوبی سے اس سرزمین پر نہ صرف پنپ رہی ہے، بلکہ اس میں روز افزوں برکت اور اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارا یہ چھوٹا سا سماج کئی واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹوں میں منقسم ہو کر رہ گیا ہے......... جسے ہم گروہ یا جماعت کہتے ہیں، ان کی تعداد تو یہاں درجنوں میں ہے، لیکن ہم صرف یہاں ایسی چار جماعتوں کا ذکر کرنا

مناسب سمجھتے ہیں، جو فی الوقت با اثر کہلائی جاسکتی ہیں اور یہ ہیں ....گرم دَل، نرم دَل، دھرم دَل اور (بے) شرم دَل۔ان سب جماعتوں سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔

وہ لیڈر جن کی بنیادیں سیاسی شاطری پر ہوں
اُنہیں مت یارِ غار سمجھو وہ مارِ غار ہوتے ہیں

گرم دل: اس دَل کا دعویٰ ہے کہ ریاست میں عموماً اور وادی میں خصوصاً اس کے حامیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔کیونکہ یہی وہ واحد دَل ہے، جو عوامی جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے اور گزشتہ دوتین دہائیوں سے مظلوم، محکوم، معصوم اور بے زبان کشمیریوں کی رہنمائی کرر ہا ہے۔انسانی حقوق کی وکالت کرر ہا ہے۔اس دَل کا منشور ریاست جموں وکشمیر کو ہندستان کی غلامی سے نکال کر پڑوسی ملک میں ضم کرنا ہے۔اُس کے لئے اس دَل نے کچھ گرما گرم پروگرام بھی چلائے۔گرما گرم بحثیں بھی کیں۔گرما گرم بیانات تو شب و روز دیتے رہتے ہیں۔مختلف سرکاری، دینی، تجارتی اور سماجی ادارے سال کا کلنڈر شائع کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔انہیں کوئی نہیں لیتا، بلکہ ہر شخص گرم دَل کا کلنڈ ہی مانگتا ہے۔صرف اس بنیاد پر کہ گرم دَل کا دعویٰ حقائق پر مبنی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دَل جب بھی ہڑتال، بند یا احتجاج کی کال دیتا ہے، پوری وادی اسے لبیک کہتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔نقصانات، درد، تکالیف پہنچیں، لیکن گرم دَل اُن کی توقعات پر پورا اُترتی ہے۔اس دَل کا منشور آفاقی تصور کا علمبر دار ہے کہ انسان (پیدائشی) آزاد پیدا ہوا ہے۔اس لئے وہ اسے اپنے سیاہ وسفید، نفع و نقصان، خوشی وغم کا ذمہ دار خود رہا ہے اپنی زندگی خود اپنی خوشی اور مرضی کے مطابق جینے کا حق رکھتا ہے۔خود اختیاری اور سیلف گونس اس کا پیدائشی حق ہے، اس لئے ریاست کے عوام کو حقِ خود ارادیت دیا جانا چاہیئے۔اس کے لئے اس دَل کے پاس اقوام متحدہ کی

قرار دادوں کے متن اور مسودات بھی ہیں۔ان قرار دادوں کو عملی جامہ پہنانے پر زور دے رہا ہے۔(الگ بات ہے کہ اقوام متحدہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی)۔ابتداء میں گرم دَل خود بھی کئی ہم خیال جماعتوں اور گروہوں کا مجموعہ تھا،لیکن کچھ گروہوں کو زیادہ گرمی راس نہ آئی تو انہوں نے چنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے دَل کے منشور پر چلنے کی ٹھانی اور اپنی جماعت کا نام نرم دَل رکھ لیا۔اس دَل نے اپنی تنظیم کو صرف سیاسی ایجنڈے تک ہی نہ رکھا، بلکہ حقِ خود ارادیت اور آزادی کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل، سماجی معاملات وغیرہ کو بھی شامل کر لیا۔اس دَل کے پیروں تلے اب تین پلیٹ فارم ہیں۔......مذہبی، سیاسی اور سماجی۔اس دَل کے رہنماء جب مقدس مقامات میں گرجتے ہیں تو ایسا ماحول بن جاتا ہے کہ تو لگتا ہے کہ اصل میں گرم دَل یہی ہے۔لیکن وہی مخصوص قسم کے حاضرین کے خیالات اور اعتقادات بدستور ستّر اسی برسوں سے ایک جیسے چلے آرہے ہیں۔ان کے معرکے اور لڑائیاں خونخوار ''شیروں'' سے رہی ہے۔اس کے ٹارگٹ آج بھی ''شیر'' ہیں وہ آج تک ان ''شیروں'' کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہیں۔

نرم دَل والے کہتے ہیں کہ وہ اصل میں نرم دِل والے ہیں۔وہ اپنے معاندین کے ساتھ معاملات اور تنازعات گفت وشنید سے نپٹائیں گے۔ہم خون خرابے، مار دھاڑ اور پڑ تالوں میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔کیونکہ ان سے بہر حال غریب لوگوں کو ہی کئی طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑ رہے ہیں۔نرم دَل والے یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دَل میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ قسم کے رہنماء شامل ہیں۔اس لئے انہیں اپنی موجودہ اور آیندہ نسل کو تعلیم یافتہ بنانے، روشن ضمیر اور کشادہ ذہن نسلِ انسانی میں بدلنے میں زیادہ دلچسپی ہے، جسے وہ ترجیح دیتے ہیں۔

نرم دَل کے بارے میں گرم دَل والے کہتے ہیں کہ دراصل یہ دَل بُز دِل ہے اور

ہمت ہار چکا ہے۔اس نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور سمجھوتہ کرلیا ہے۔اس دَل کی عوامی ساکھ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔(واللہ اعلم) مبصرین اور تجزیہ کاروں کا یہ خیال ہے کہ دونوں ....کا مینی فیسٹو دراصل ایک ہی ہے، بس ایک واضح فرق یہ ہے کہ گرم دَل والے ''انضمام'' کے حق میں ہیں اور نرم دَل والے مکمل آزادی کے وکیل ہیں اور عوام ابھی اس فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ وہ اس کنفیوژن کے شکار ہیں کہ اگر ۵ جمع ۵ دس ہوتے ہیں تو ۳ جمع ۷ بھی تو دس ہوتے ہیں اور ۶ جمع ۴ بھی ....ان میں کس کو صحیح مانا جائے اور کس کو غلط۔(مورخین، مبصرین، تذکرہ نگاروں اور سفراء نے ایک بات پر اتفاق کیا ہے کہ کشمیری کبھی نہ متحد ہو سکے ہیں اور نہ ایک بات پر متفق، کیونکہ یہ مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

آریائی، ایرانی، یہودی، عربی، ہندو، بودھ، مغل، پٹھان اور افغان) اس لئے ان کے خیالات اور عقاید میں صدیوں سے اختلافات اور انتشار موجود ہے۔

وادی میں تیسرا سرگرم دَل........ دھرم دَل ہے۔بظاہر یہ دَل وادی کے مسلمانوں (جنہیں حلقہ بگوش اسلام ہوئے سات سو سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے) کو صحیح اور اصلی اسلام سے روشناس میں سرگرم اور کوشاں ہے۔اس دَل کا ہر فرد بزعم خود ایک ''مفتی'' ہے اس دَل میں بھی بیسوں دَل ہیں، جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اصل میں وہی اصلی خدا کے بندے ہیں اور اللہ کے دربار سے صرف انہیں ہی تسلیم شدہ اور رجسٹرڈ لائسنس یافتہ دَل کی سند حاصل ہے۔باقی سب کافر اور ملحد........،

ان گروپوں اور جماعتوں کے افراد نے نہ صرف اپنے اپنے دفاتر بلکہ مسجدیں بھی الگ الگ ناموں سے تعمیر کر کے ان میں اپنے اپنے دینی عقاید اور مسلکی نظریات کی تشہیر و تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔عام مسلمان جب نماز پڑھنے کے

لئے یا اللہ (جو ایک ہی ہے) کی عبادت کے لئے یا اپنے خالق سے کچھ مانگنے کے لئے اس کے دربار کا رُخ کرتا ہے تو وہ پہلے اس عبادت خانے کے دروازے پر لٹکے ہوئے بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس گھر میں نعوذ باللہ کون سا خدا ہے۔

بعض اوقات اَن پڑھ یا نا خواندہ مسلمان اپنی سادگی سے اللہ کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے، تو وہاں سے کنفیوژ ہو کر نکلتا ہے۔ دھرم دَل میں تعلیم یافتہ عالم بھی ہیں۔ نیم خواندہ ملاّ خطرۂ ایمان مولوی بھی ہیں۔ کچھ افراد کو پیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کی صحیح ڈیفی نیشن ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آسکی ہے۔ اس کا ہم وزن دوسرا لفظ فقیر ہے۔ ان دونوں کے لغوی معنی کچھ اور ہیں اور دھرم دل میں یہ حضرات بھی اہم کردار کے حامل ہیں۔ جہاں بھی ایسے کردار کا ٹھکانہ یا بیٹھک ہوتی ہے، وہاں عوام جن میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، کا مجمع لگا رہتا ہے۔ دھرم دَل میں یہ لوگ کافی با اثر ہوتے ہیں۔ صوفیائے عظام، روحانیت اور تصوف کے قائل حضرات اور دوسرے علماء اور مولوی صاحبان کے درمیان شب و روز چپقلش چلتی رہتی ہے۔ لیکن فی الوقت زیارت گاہوں، آستانوں اور سیر گاہوں سے وابستہ صوفی مسلک والوں نیز روحانی بزرگوں کا پلہ بھاری ہے۔

دھرم دَل کسی ایک مخصوص مذہب کا دَل نہیں، بلکہ ریاست میں جتنے بھی مذاہب ہیں، ان کی نمایندگی دھرم دَل میں ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی یہ دَل ہمیشہ سرگرم ہے۔ یہ اتنے سیدھے سادے اور نادان ہیں کہ ہمیشہ سیاسی دَلوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے رہتے ہیں۔ سیاسی دَل انہیں بُری طرح سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مقدس مقامات پر عقیدتمندوں اور عابدوں کے سامنے اکثر تقریر

کرنے والے وہی سیاسی لوگ ہوتے ہیں، دھرم اور دیا کا چہرہ پہن کر مذہبی تہواروں میں دینی شخصیات کے آگے آگے رہتے ہیں۔ ہر مذہبی تہوار اور مقدس ایام کے موقعوں پر لوگوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ دھرم دَل کی ایک اور خصوصیت ہے کہ یہ کسی کے ہاں جائیں یا نہ جائیں.........لوگ انہیں خود بلا کر لے جاتے ہیں۔ ہر خیر و شر کے موقعے پر انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

چوتھا دَل اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو مقتدر جماعتوں اور بااثر افراد پر مشتمل ہے۔ دَل گزشتہ ۶۵ برسوں سے عوام کی چھاتیوں پر مونگ دَل رہا ہے۔ بظاہر یہ دَل عوامی نمائندگی کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ وہ ایک جمہوری طریقے سے عوام کا منتخب دَل ہے، جسے عوام نے حکومت کرنے کے اختیارات تفویض کیئے ہیں۔ کسی حد تک اس دَل کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ وہ عوامی ووٹ کے ذریعے حکومت کے ایوانوں تک پہنچا ہے، کیونکہ گرم دَل کی ہر بات لوگ مانتے ہیں۔ کئی کئی مہینوں تک ہڑتال کر سکتے ہیں، احتجاج کر سکتے ہے، لیکن جب انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کرتے ہیں، تو اُسے عام طور پر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ لوگ جوق در جوق ہزاروں کی تعداد میں انتخابات میں حصہ لینے کے لئے ووٹنگ بھوتھوں پر پہنچتے ہیں۔ اس دو عملی روّیے کے بارے میں پوچھنے پر لوگوں نے کہا کہ آزادی کب ملے گی، اُس کا کوئی پتہ نہیں، لیکن تب تک ہم دوا کی ٹکیہ، پانی، اناج وغیرہ کا انتظار نہیں کر سکتے۔

دنیا کے ہر ملک کا ایک انتظام ہوتا ہے اور جب کبھی بھی انقلاب آتا ہے، وہ اسی دَل کی بے ضابطگی، ظلم اور عوام دشمنی و نا انصافی کے ردِ عمل میں رونما ہوتا ہے۔ انقلابات کے نتیجے میں کوئی نیا دَل وجود میں آتا ہے، یہ دَل کبھی مرتا نہیں، کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔ اصلی جمہوری نظام ہو تو سسٹم میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ عوام

کے دکھوں، مصائب اور تکالیف کا کما حقہ ازالہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد عوام اسے بھی بدل دیتے ہیں۔ جسے Anti incombarcy رجحان کہتے ہیں۔

روسی انقلاب کا جو حشر ایک ہی صدی کے اندر اندر لوگوں نے دیکھ لیا۔ انہوں نے روسی انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہوں نے اس انقلاب کا حشر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جنہوں نے روس کے زاروں کے خلاف یہ نعرہ لگایا تھا کہ

بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت عصرِ حاضر کی سیاست سے، ترانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

۹۰ سال کے بعد انہوں نے یہ گیت بھی گایا کہ

مفاہمت نہ سکھا ظلمِ ناروا سے مجھے
میں سر بہ کف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

طبیعت کے فساد نے جن بندوں نے اپنے آقاؤں کے خیموں کی طناب توڑ ڈالی تھی، انہوں نے بورژوائی قوتوں کے خلاف پرولتاری نظریئے کی آبیاری کی تھی اور نہ پھر پرولتاری دَل رہا اور نہ بورژوائی......لوگوں کے مرنے کے باوجود تبدیلی والی نفسیات برقرار رہی۔

ہمارا موضوع کشمیر کا چوتھا (بے شرم) دَل ہے۔ اس دَل میں شامل لوگ بھی اسی دھرتی کے فرزندگان ہیں، نہ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے ہیں اور نہ کسی دوسرے ملک سے آئے ہوئے فرشتہ خصلت لوگ ہیں۔ وہ ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ اسی مظلوم و محکوم قوم کے افراد اور شہری............بقول سر سید احمد خان........جیسی رعایا ہوتی ہے، ویسی ہی حکومت (یہاں اس قوم کی اہانت مقصود نہیں) ہمارے (بے)

شرم دَل سے تعلق رکھنے والے بھائی اور بیٹے.........اپنے اسلاف کا حق ادا کر رہے ہیں۔ وہ ہمارا آئینہ ہیں اور جب ہم اس آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی صورت نظر آتی ہے۔ ہماری اس چھوٹی سی جنّت کا ہر باسی ان دلدلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ آئے دن ایسے تماشے اور ڈرامے دیکھنے کو ملتے ہیں، جن کے کردار ہم ہی ہیں۔ واقعات اور مناظر بھی دیکھے بھالے اور جانے پہچانے ہیں۔ بیرونی مداخلت سے البتہ کبھی کبھی ہمارے جذبات اور احساسات مجروح ہو جاتے ہیں اور ہمیں جان سے پیاری جنّت.....جہنّم لگنے لگتی ہے۔ اس کے لئے بھی یہ سارے دَل ذمہ دار ہیں۔ بنیادی طور سے یہ.....شرم دَل بھی ٹائم پاس پالیسی پر گامزن ہے، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق یہ دَل دو دو ہاتھ سے اس جنّت کے خزانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ چپراسی سے لے کر چیف سیکرٹری اور پنچ سے سی، ایم تک شرم دَل والے غلاظت کے دلدل میں ٹھوڑی تک ڈوبے ہوئے ہیں اور بڑی تیزی سے دھنستے جا رہے ہیں۔ انہیں نہ جنّت سے دلچسپی ہے نہ جنّت کے باسیوں سے، بلکہ ان کی منزل دوزخ کے سوا کہیں نہیں۔

کیوں نہ جنّت میں جہنّم کو ملالیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

شرم دَل بجائے خود کئی بے شرم دلوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ مقامی اور کچھ غیر مقامی دَل بھی شامل ہیں، جو گزشتہ ۷۰ سالوں سے یہاں کے عوام کی گردنوں پر پیرِ تسمہ پا کی صورت میں چڑھ بیٹھے ہیں۔ ان کو قوم.........وہ کون سا سوم رس پلا دیں، جس سے قوم کی گردنیں آزاد ہوں اور ''سند باز جہازی''، یعنی کشمیری قوم کنارے لگ کر سکون کا سانس لے سکے۔

سیاست

سیاست کے لغوی معنی ہیں 'حکومت'، آئین، حاکمیت، نظامِ حکومت، حکومت کا گُر۔ اصولِ حاکمیت.....جو حاکم ہوں، اُن کے نظریات وعقاید........ہوسکتا ہے کہ اس کے معنی اور مطالب (اور کچھ) ان کے علاوہ بھی ہوں۔ کیونکہ ہر چیز اور نظریئے کی اہمیت اور شناخت کا تعین (ظرفَ) مکان اور (ظرفِ) زمان کے حوالے سے کیا جاتا رہا ہے۔ زمان ومکان کا فیکٹر فطرت سے متعلق ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کے بس سے باہر کی چیز ہے۔ مثال کے طور پر ریگستان یا سطحِ سمندر سے معمولی اونچے والے خطے میں برف باری نہیں ہوسکتی اور جو جانور، کیڑے مکوڑے اور نباتات ریگستانی علاقے میں پائے جاتے ہیں، وہ قطبین کے یخ بستہ فلک بوس پہاڑوں پر نہیں ہو سکتے۔ کشمیر میں جنوری کے مہینے میں شالی (دھان) یا خریف میں فصلیں نہیں اُگائی جاسکتیں ہیں، نہ سعودی عرب میں سیب یا زعفران اُگایا جاسکتا ہے۔ اگر جون یا جولائی میں یہاں برف باری ہو جائے تو اُسے ایک انہونی غیر معمولی بات ہی سمجھا جائے گا۔ اس سے قیامت آجائے گی۔ بالکل فطرت کے اصولوں کو کسی بھی صورت میں بدلا نہیں جاسکتا۔ عقاید اور اصول قدرتی نہیں ہوتے۔ یہ کائنات میں یکساں بھی ہوسکتے ہیں اور ان میں اختلاف بھی ممکن ہیں۔ بولنا، قتل کرنا، بہن کے ساتھ شادی کرنا، ماں یا بیٹی کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا۔ یہ چیزیں دنیا کے کسی بھی خطے میں یا کبھی بھی کسی بھی صورت میں جائز

نہیں مانے جاتے۔کم سے کم دنیا کا کوئی بھی انسان اِن عادات کو ٹھیک تسلیم نہیں کر سکتا۔ہاں حیوانوں میں ان باتوں کی کوئی قید نہیں۔ یہ زندگی کے بنیادی اخلاقی اصول ہیں، جو ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان کی قید سے آزاد ہیں۔لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جو اگر کل جائز تھیں تو آج ناجائز ہیں یا دنیا کے ایک ملک میں جائز قرار دی جاتی ہیں تو دوسرے ملک میں ممانیت ہے۔اصول اور قوانین وضوابطِ حیات گو خالقِ حقیقی نے ہمارے لئے مقرر کر رکھے ہیں، لیکن ابتدائے آفرینش سے ہی ان میں ترمیمات اور اصلاحات بھی ہوتی رہی ہیں۔کہیں اگر اللہ کے بھیجے ہوئے ہادیوں اور مُرسلین نے اس میں تبدیلیاں لائیں (بہتری کی طرف) تو کہیں بندوں نے اپنی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر اپنے قوانین وضوابط خود وضع کئے۔اس کی اجازت لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔شاید اس لئے کہ خدا نے بندے کو فعلِ مختار اور حیوانِ ناطق بنایا ہے۔اور اسے خلیفۂ خدا جیسا رُتبہ بھی عطا کیا ہے......... لیکن اس کے ساتھ ساتھ مقدس صحیفہ جات کو نازل فرما کر اُن کے لئے ایسے راستے متعین فرمادئے جو فطرت کے عینِ مطابق بھی ہوں اور وہ نیکی اور فلاح کی منزل کی طرف لے جاتے ہوں۔

مُرغے کا حلال ہونا، سور کا حرام.......... مچھلی کا مرنے کے بعد بھی بغیر ذبح کئے حلال قرار دیا جانا، شراب پینا وغیرہ یہ چیزیں ضوابطِ حیات میں کسی ملکی یا جغرافیائی خطے کے قانون کے مطابق جرم نہیں لیکن مذاہب اور ادیان میں ان کے لئے ضوابط کا تعین کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ کوئی اشتعال انگیز اور خلافِ قانون جرائم نہیں۔اگر دینِ اسلام کو ماننے والا شخص شراب پینے یا سور کا گوشت کھائے تو وہ اپنے رب کا مجرم اور گنہگار ہو گا۔کیونکہ وہ اپنے دین کے ایک قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے۔جس کے لئے وہ اللہ سے معافی مانگ سکتا ہے اور توبہ کر کے ان گناہوں کی سزاؤں سے بچ سکتا

ہے، لیکن اگر وہ کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے تو وہ اللہ کے نزدیک بھی ایک مجرم ہے۔ اپنے مذہب میں بھی معتوب اور ملکی قانون کے تحت بھی مساوی سزا کا مستحق ہوگا۔ دنیا کا کوئی بھی فرد یا منصف یا عدالت اُسے معاف نہیں کر سکتی۔

اس حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہنا بجا ہے کہ یہ ساری کائنات اور مخلوق کے لئے مشترک آئین یا یکسان آئینِ حکمرانی ہونا اور حاکمیت کا اصول اور حکومت جو ریاست کے معنوں میں لئے جاتے ہیں، میں اختلاف دیکھا گیا ہے۔ اسے آج کی تاریخ تک الگ الگ معنی دیئے جا رہے ہیں۔ اور اصلاحات کئے جا رہے ہیں۔ سیاست کے مفہوم کو آج تک سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال کی ہر لغت میں اس کے معنی مقامی آبادی کی سمجھ اور ردِ عمل کے مطابق لئے گئے ہیں۔ مثلاً سیاست کو عام طور پر جھوٹ، فریب، بے ایمانی، دھوکہ اور شیطانی حربے کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی فرد (عام یا دانشور) سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ''سیاست'' نے آپ کو کیا دیا؟ تو وہ برملا کہہ اُٹھے گا...... اخلاقی دیوالیہ پن، سماجی انحطاط، خون خرابہ، منافرت، بغاوتیں، کدورت وغیرہ وغیرہ اور ''ہم سے کیا چھینا''؟ تو جواب ہوگا...... مروت، صبر و تحمل، اعتباریت، پیار و محبت، بھائی چارہ، خوفِ خدا۔ اور سب سے بڑھ کر ''انسانیت''۔ اگر انسانیت ہی نہ رہی تو پھر کیا رہا؟ اس کی تعرتف میں بھی منفی اور مثبت، تلخ شیرین چیزیں ہی کھلیں گی۔ مثلاً یہ کہ اس میں بلا کی طاقت ہے (شیطانی) طاقت۔ اس میں جادو اور کشش ہے (شاید اس لئے کہ یہ فرد کو حکومت کے ایوانوں اور اونچی اونچی اقتدار کی کرسیوں تک لے جاتی ہے) اس کے اندر ایک مٹھاس بھی ہے، ایک جمالیاتی حس بھی ہے اور جنونی کیفیت بھی ہوتی ہے جو اہلِ سیاست کو فرش سے اُٹھا کر عرش پر پہنچا دیتی ہے اور پھر عرش سے اُٹھا کر فرش پر اس طرح سے ٹپک دیتی ہے کہ بندہ سیاست کو گناہِ

عظیم سمجھ کر توبہ واستغفار کرتا ہے۔ اگر اس میں خالی جنون ہی رہتا تو پھر بھی کچھ بات بنتی، لیکن اس کے ساتھ خرد کا عنصر بھی شامل رہتا ہے......اور جب کوئی شخص عقل کا غلام بن جاتا ہے، تو ''دل'' کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

بقول شاعر مشرق ؎

صبحِ ازل مجھے کہا یہ جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

خرد کا عنصر اہلِ دانش کو بھی ہپناٹائز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی سائنسی علوم ہیں، یہ ''خرد'' سے منسلک ہیں۔ جہاں خود خرد (عقل) بھی دھنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن دنیا کے اندر جتنی بھی تباہ کاریاں ہوئیں ہیں، یہ اہلِ خرد کی ہی دین اور کارستانیاں ہیں۔ جنون جہاں ابراہیمؑ کو آگ کے الاؤ سے بھی محفوظ باہر نکال سکتا ہے، وہاں خرد اور عقل انسان کو ہیروشیما اور ناگاساکی کی طرف لے گئی ہے۔ سیاست اگر خرد کے گھوڑے پر سوار ہو جائے تو وہ گھوڑا اُسے ملوکیت جیسی غیر فطری شئی سے لذت آشنا کرتا ہے اور اگر یہ جنون کی سواری بن جائے تو خلافت نظام اور دینِ فطرنی جیسی پسندیدہ حکومت کے غیر فانی تصور سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ اس کی صحت مند روح سیاست بنی نوعٔ انسان کے لئے امن، سلامتی، مساوات، خوشحالی، انصاف اور ایمانداری سے عبارت زندگی بسر کرنے کا موقعہ فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ ''حکمران'' واقعی خلیفۂ خدا ہو اور اس کی حکومت اللہ کے قانون کے مطابق ہو۔ انفرادی طور پر بھی وہ نیک، انصاف پرور، خوفِ خدا رکھنے والا، مساوات اور جمہوریت کا علمبردار اور قابل منتظم ہو۔ وہ اپنے آپ کو خلقِ خدا کا حاکم نہ سمجھے بلکہ اللہ کے بندوں کا خادم اور ہمدرد اور کام آنے والا۔ پس کتنا مشکل اور کٹھن ہے یہ کام۔ کیا ایسا

کوئی شخص موجودہ دنیا میں مل سکتا ہے۔؟ شاید علیؓ کے بعد کوئی نہیں۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں پر خلافت کو قتل کر دیا گیا اور ملوکیت نے جنم لیا، جو مختلف اشکال میں آج تک موجود ہے۔ جبر و استبداد کی حسین پری کی طرح ہمارا دل لبھا رہی ہے۔

آج کی تاریخ میں کئی ''ازم'' بندگانِ خدا کے ذہن پر سوار ہیں اور ان کی ''ازموں'' کے خالق اور ان کی جڑوں کی ''آبیاری'' کرنے والے...... یا تو اپنی جادوگری اور شیطانی طاقت یا پھر ''مسل پاور'' کے ذریعے ساری دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں اور سیاست کے تازہ ترین مفہوم کے مطابق کمزور دماغ رکھنے والی مخلوق کو ہپناٹائز کر کے اُنہیں اپنے اشاروں پر چلا رہے ہیں۔

آج کی تاریخ میں عالمی سیاست اور طاقت کا مرکز ''وہائٹ ہاوس'' ہے، میں آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے ایک بہت ہی پیارے اور بے تکلف دوست نے مجھے ''واشنگٹن'' سے ایک خط لکھا، جس کا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ ''میں اس وقت وہائٹ ہاوس کے باہر کھڑا آپ کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے دعا مانگ رہا ہوں'' اس جملے میں کفر کا عنصر تو موجود ہے، لیکن ایک ایسا طنز بھی جو ہم سب کے لئے باعثِ شرمندی و عبرت ہے۔ اس میں کوئی شکایت نہیں کہ ''وہائٹ ہاوس'' ہی ایک ایسا ادارہ ہے، جس کی طرف ساری دنیا کے لوگوں کی نظریں مرکوز ہیں، جہاں دنیا کے اربوں لوگوں کے لئے زندہ رہنے کے اصول و ضوابط وضع کئے جاتے ہیں۔ جہاں ''سیاست'' ''مینوفیکچر'' ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی لیبارٹری ہے، جہاں مختلف قسم کے ''سیاسی تجربے'' ایک عمل میں لائے جاتے ہیں۔ یہ وہ صداقت ہے، جہاں پر ہماری مرضی کے خلاف (یا پھر ہماری رائے جانے بنا ہی) ہمارے مستقبل کے بارے میں فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ اور جو سارے عالمی سازشوں کا اڈہ ہے۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ''آپ'' چند لوگوں کو ''ہمیشہ کے لئے'' بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ ''آپ سب لوگوں کو'' کچھ وقت'' کے لئے بے وقوف بنا سکتے ہیں، لیکن آپ'' سب لوگوں'' کو ''ہمیشہ کے لئے'' بے وقوف نہیں بنا سکتے۔

یہ مفکرین کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ نپولین ہل نے ایک مرتبہ ایک خالی ڈسٹ بن ایک ڈسٹ بن میں لے جا کر اُلٹائی اور پلیٹ کو ڈسٹ بن کے ساتھ زور سے ٹھونک کر آواز نکالی تو قریب سوئے ہوئے کُتے کی آنکھ کھُل گئی۔ نپولین گیا تو کُتا آ گیا۔ اس ڈسٹ بن میں منہ ڈال کر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہاں کچھ نہ پا کر پھر جا کر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ نپولین نے یہ حرکت متعدد بار دہرائی اور ہر مرتبہ کُتا آتا اور ڈسٹ بن میں دیکھتا اور کچھ نہ پا کر چلا جاتا۔ لیکن ایک مرتبہ نپولین نے ایسا دیکھا کہ باوجودیکہ اُس نے پلیٹ کے ذریعے گوشت اور ہڈیاں بھی ڈسٹ بن میں ڈالیں، لیکن کُتے نے نہ آنکھیں کھولیں نہ جنبش کی۔ اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ کسی کو بھی بار بار بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا، خواہ وہ کُتا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام میں اس حوالے سے ایک زرین قول ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''مسلمان ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا''۔ ''سیاست'' کے بغیر آج کوئی جگہ خالی نہیں۔ گھر، دفتر، عبادت گاہ، بازار، ٹرین، ہوائی جہاز، کھیت کھلیاں، کھیل کا میدان، رسوئی، دھوبی گھاٹ، نائی نان بائی، حلوائی اور قصائی کی دکان، ہر جگہ اس کا ذکر ہے۔ اس کی تجارت ہوتی ہے۔ اس کی عبادت ہوتی ہے۔ اسے نہ کسی لائسنس کی ضرورت ہے نہ علم و دانش کی۔ نصابِ تعلیم میں ''سیاست'' ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

ہمارے پڑوسی کی بیگم نے شوہر کے رویئے سے تنگ آکر ایک دن کہا ''تم میرے ساتھ سیاست کھیل رہے ہو۔ میرے سامنے سیاست نہیں چلے گی۔ میں

سیاست کی اُستانی ہوں" تو شوہر نے یہ شعر پڑھا۔

تم سیاست گر بیوی ہو اور میں ستم رسیدہ شوہر
تم سیاسی مار ہو اور میں مار گزیدہ شوہر

اتنے میں اُن کا گھریلو خادم آدھمکا اور بولا۔

اس گھر کو یو، این ،او نہ بناؤ مالک
ایک دوجے پہ الزام نہ لگاؤ مالک
میں آپ کا وفادار خادم ہوں حضور
مجھ سے اپنا فیصلہ کراؤ مالک

موجودہ دور میں سیاست ہر "بالغ" کی رگ و پے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے، کہ گویا اب ہر ایک کا اوڑھنا بچھونا ہی سیاست بن گیا ہے۔ ظاہر اگر سیاست زدہ ہے تو باطن سیاست گزیدہ۔ ہٹلر نے ایک مرتبہ کہا "میری سیاست یہ ہے کہ میں دنیا کو سیاست دانوں سے آزاد کرنا چاہتا ہوں"۔ تورگیف کا قول ہے کہ "سیاست ایک فاحشہ ہے، اس رنڈی کے ساتھ جسمانی رشتہ جوڑنا جیسے خود اپنی آبروریزی کے مترادف ہے"۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا خیال ہے کہ "سیاست اپنانے سے روح کی موت ہو جاتی ہے"۔ مولانا ظفر علی خان نے اخبارِ "زمیندار" میں اس موضوع پر کیے گئے ایک مناظرے میں لکھا ہے کہ سیاست ہمارے دین و ایمان کو آلودہ کر دیتی ہے"۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا خیال ہے کہ "سیاست غلاظت ہے، جس نے گاندھی کے کردار کی شفافیت کو بھی مشتبہ بنا دیا۔ اقبال کے اس شعر کو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا سیاق و سباق کے بغیر اپنی صفائی یا پھر اپنے دفاع کے طور پر پڑھتا ہے کہ

جُدا ہو دیں سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سیاست کو دین سے الگ کر دیا جائے تو (دین) چنگیزیت بن جاتا ہے، بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اگر فطرت کے اصولوں سچائی، انصاف اور صحت مند دینی نظریات کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو ''سیاست'' ''چنگیزیت'' رہ جاتی ہے۔ انہوں نے خلافت کے نظام کو قرآنی سیاست کہا ہے اور جب ملوکیت کا نظام قائم ہوا تو اُس کے اندر چنگیزیت آ گئی۔ یہ موضوع بے حد طویل اور بحث طلب ہے۔ لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ آج حکومت کے دعویدار اور خواہش مند ''سیاسی پارٹیاں'' بنا لیتے ہیں۔ وہ پارٹیاں حکومت میں رہیں یا حزبِ اختلاف کے بینچوں پر بیٹھیں اپنے آپ کو ''سیاسی جماعت'' کہلواتی ہیں۔ میں نے کراچی میں ایک شخص سے پوچھا ''آپ کا شغل یا پھر پیشہ کیا ہے''؟ تو اُس نے بڑے فخر اور تمکنت سے کہا ''ہم سیاست کرتے ہیں''۔ حالانکہ وہ حزبِ اختلاف کی ایک سیاسی جماعت کا ورکر تھا۔ اُس کی سیاسی جماعت آج تک بھی وفاق یا صوبے میں برسرِ اقتدار نہ آسکی۔ بالکل اسی طرح ہمارے ملک میں بھی ایک ناقص اور بیہودہ سیاسی نظام قائم ہے، جو حقیر مفادات کے لئے اپنی حیثیت کا سودا معمولی ٹکوں کے عوض کرتے رہتے ہیں اور اس طرح سے سیاست کو اس کے اصلی معنوں اور روح کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بغداد کی حسینہ سے
سونہ مرگ کی بکری تک

دیو مالائی قصوں اور داستانوں کا دلدادہ کون نہیں۔کون ہوگا جس نے اپنی وادی کے بزرگوں یا قصہ گو حضرت سے پرانے زمانے کے بادشاہوں، شاہزادوں، شہزادیوں، ظالم وزیروں، منافق امیروں، خادماؤں، کنیزوں، غلاموں، بہادر جرنیلوں اور سپہ سالاروں، درباریوں اور دربانوں، ماہرِ جنگ سپاہیوں، خواجہ سراؤں، سوتیلی ماؤں، میوں، درباری عالموں اور سیانوں، شاطر اور خوش آمدی درباریوں، جادوگروں، حکیموں، طبیبوں اور پہلوانوں کی کہانیاں نہ سُنی ہوں۔ جب تلک ہم یہ کہانیاں زبانی سُنتے رہے، ہمیں ان داستانوں کے ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان کا کوئی اندازہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ ہم اپنے گاؤں کے سوا کسی اور نام سے واقف نہ تھے۔ نہ ہم نے کوئی بادشاہ دیکھا تھا، نہ وزیر نہ کوئی جادوگر، نہ پہلوان۔ البتہ شام ہوتے ہی ہمیں خیال آتا تھا کہ اس دنیا میں ہمارے بغیر بھی کوئی ایسی مخلوق ہوتی ہوگی، جو رات کی تاریکی میں حرکت میں آتی ہو گی۔ جب کوئی الّو یا الو کا پٹھا بغل کے اخروٹ کے پیڑ پر ہُو ہُو کرتا یا انتہائی خاموشی میں کُتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو ہمارے بدن میں ایک سرد جان لیوا سی لہر دوڑ جاتی اور سُننے

والے کے رونگھٹے کھڑے ہوجاتے۔

''شاید وہ آگئے۔''

''کون؟''

لیکن یہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ کون!؟ رفتہ رفتہ ہم بڑے ہوتے گئے اور پھر ایسی ہی کہانیاں ہم درسی (نصابی) اور غیر نصابی کتابوں میں پڑھنے لگے۔ الف لیلیٰ یعنی ہزار داستان، قصہء چہار درویش، گلِ صنوبر، گل بکاؤلی، بغداد کا جادوگر، بغداد کا چور، بغداد کی حسینہ، بغداد کا بادشاہ، بغداد کی ملکہ، جادگر حسینہ، پری حسن بانو، شہزادہ گلفام، ظالم بادشاہ، آدم خور حسینہ، علی بابا چالیس چور، الہ دین کا چراغ، طوطا مینا، عقلمند وزیر، بے وقوف بادشاہ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ کہانیاں ''بغداد'' کے بادشاہوں، ڈاکوؤں، چوروں، تاجروں، حسیناؤں، پریوں اور جادوگروں کی ہوتی تھیں............ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ بغداد کہاں ہے۔

آگے بڑھے تو ماسٹر جی نے جغرافیہ پڑھاتے ہوئے دنیا کا نقشہ دکھایا۔ ہر چند کہ عراق کشمیر سے صرف ۶ یا ۷ انچ ہی دور تھا، لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ نقشے میں ایک انچ کا پیمانہ ایک ہزار میل کے برابر ہوتا ہے۔ بہر حال جب کہانیوں اور داستانوں کے سب کردار ہمیں اپنے ہی دیس میں ملے تو ہمیں عرب اور عراق سب کچھ بھول گیا۔

ہم نے یہاں ہزاروں علی بابے اور ہزاروں چور نڈر اور بے خوف دن کے اُجالے میں بھی گھومتے دیکھے۔ حسین دوشیزاؤں کے بھیس میں پریاں بھی دیکھیں۔ ہیبت ناک اور آدم خور جن اور دیو بھی دیکھے۔ چار نہیں بلکہ ہزار مکار درویش بھی دیکھے۔ شاطر جادوگر بھی دیکھے، ظالم حکمران فاقہ کش عوام چاپلوس اور خوش آمدی جی حضوری۔ سرکاری درباری بھی دیکھے۔ سوتیلی مائیں اور ان کے سلوک کا مزہ بھی

چکھا۔ سب ظلم زیادتیاں سہے۔ خواجہ سراؤں کی بستیاں بھی دیکھیں۔ راشی دربانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ غرض ان دیو مالائی کہانیوں کو کتابوں سے باہر اور دادی اماں کی زبان سے نکلے ہوئے ہی نہیں، بلکہ ہر سڑک، ہر دفتر، ہر میدان اور ہر جگہ کہیں بکھرے ہوئے دیکھا، کہیں متحرک دیکھا.........اُن کرداروں سے توجہ ہٹ گئی، جو بچپن سے ہی ہمارے شعور کے تہہ خانوں میں جگہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کسی وردی پوش پولیس والے کو دیکھا تو لاشعور سے کوہِ قاف کا پہلی ڈیوڑھی والا ماما جن نکل آیا۔ جب اس سے بڑے صاحب پر نظر پڑی تو حسن پری کے باغ کے اُس پہرنے دار پر کی ہیبت ناک شکل ذہن کے کینواس پر اُبھر آئی، جس کے سات سر تھے۔ ایک بھیڑئے کا، ایک بھالو کا ایک اژدھے کا اور وغیرہ وغیرہ۔ جب اپنے گھر کے باہر مورچے کے پیچھے انسانی چیخوں کی دلدوز صدا سُنائی دی تو وہ لمبے لمبے دانتوں اور ناخنوں والا آدمی کا گوشت کھانے والا دیو جو حسن پری کا چاچا لگتا تھا، یاد آگیا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی مادہ بھیڑ کا پیٹ پھاڑ کر زندہ میمنے کو نکلوا کر اُس کی کھال اُتار کے اُسے ڈبل ڈیکر ٹوپیاں (قراقلی) بنانے والے سماج کے اونچے طبقے کے منتخبہ افراد کے سر پر پہنتے دیکھ کر اُس سنگ دل خاتون کی یاد آگئی، جس نے حضرت حمزہؓ شہید کا سینہ چیر کر چبایا تھا۔ ہم نے اپنی تھوڑی سی عمر میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا، جنہیں عرفِ عام میں سیاسدان بھی کہتے ہیں .... اِنہیں کئی چہرے پہنتے دیکھا۔ یہ چہرے ان کے کوٹ اور واسکٹ (صدری) کے جیبوں میں ہمیشہ دستیاب ہوتے ہیں۔ انہیں جب کبھی جس چہرے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہی چہرہ نکال کر لگا لیتے ہیں۔ ہم ان درباری جی حضوریوں کو ان کی قیمتی موٹر کاروں میں دیکھتے ہیں، جو اپنے آقاؤں کے لئے اُن چھوٹی اور فرش (Fresh) حسیناؤں کو پھانسنے اور اُنہیں ان آقاؤں کی خواب گاہوں تک پہنچانے کی فکر میں گھومتے

ہیں۔ہم نے ایسے ذی وقار شہریوں کو بھی دیکھا، جو انتخابات میں سب سے زیادہ ''ووٹ'' حاصل کر کے عوام کے سینوں پر مونگ دَلنے کا لائسنس حاصل کر لیتے ہیں، جو چھ برس کے لئے Valid ہوتا ہے۔ایسے بزرگوں سے بھی ملے جو یہ کہہ رہے تھے کہ لوگوں کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے، اس لئے ان کی ''خدمت'' کرنے اور آرتی اُتارنے کا حق صرف اُنہیں حاصل ہے۔یہ سُن کر ہمیں بغداد کی اُس طوائف کی کہانی یاد آجاتی ہے، جو اپنے آپ کو 'خاندانی' کہتی تھی اور دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھی کہ اُس کے کوٹھے کے دروازے پر اُن کے چاہنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی، جب کہ اس کے مقابل کے مکان کے دروازے پر ایک مریل اور خارش زدہ کُتا اپنا سر ٹانگوں میں چھپائے سویا رہتا تھا۔ کیونکہ اس مکان میں ایک نیک، پارسا اور شریف خاتون رہتی تھی۔

جب میں اپنے شہر کے قاضی کے کارنامے سُنتا ہوں، جنہیں وکیل صاحب قانون کی کتاب میں ایک ہزار نوٹ رکھ کر کہلواتے ہیں کہ دفعہ نمبر ۱۰۰ کے مطابق وکیل صاحب کا دعویٰ صحیح ہے تو مجھے بغداد کے ایسے سادہ لوح شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔جو ایک راس گدھے کا مالک تھا۔گدھے نے اُسے بہت تنگ کر رکھا تھا۔روز بھاگ جاتا تھا۔ایک شاطر جادوگر نے اُس سے ۱۰۰ اشرفیاں فیس لے کر کہا کہ وہ اس کے گدھے کو انسان بنا دے گا۔وہ جادوگر گدھے کو اپنے ساتھ لے گیا۔اُسے دور کسی جنگل میں چھوڑ آیا۔دوسرے دن گدھے والے سے کہا کہ اُس کا گدھا آدمی بن گیا ہے۔وہ اب اس شہر کا قاضی بن گیا ہے۔چند دن توقف کے بعد وہ گدھا والا قاضی کی عدالت میں جا دھمکا اور اپنی جھولی میں کچھ اناج اور کچھ گھاس رکھ کر قاضی صاحب کو دور سے دکھانے لگا اور منہ سے ایسی آوازیں نکالتا رہا جو گدھے کو بلانے کے لئے نکالتا تھا۔قاضی صاحب نے اُسے بلا کر پوچھا ''یہ کیا حرکت ہے؟ تم کون ہو؟ اور کیا چاہتے

ہو"؟۔وہ شخص بُرا سا منہ بنا کر بولا"واہ میرے گدھے! اب قاضی بن کر مجھے پہچانتا ہی نہیں۔ چلو اپنے گھر میں تمہاری خبر لوں گا۔" قاضی پہلے اُسے پاگل سمجھا تھا۔ پھر قاضی صاحب کے کہنے پر اُس کی ساری کہانی سُنی گئی تو قاضی صاحب نے مسکرا کر کہا"ٹھیک ہے مالک میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔" قاضی صاحب اپنے آدمیوں سے اُس کا گدھا ڈھونڈ کر لایا اور اُس کے حوالے کر دیا۔ اُس شخص نے اُس گدھے کی خوب پٹائی کی کہ کہنے لگا"جب قاضی بن کر بیٹھتا تھا تو مجھے جیسے جانتا ہی نہ تھا۔ اب آ گیا پھر میرے دروازے پر"۔

ہمارے ایک چچا ہیں گل محمد۔ مرنجانِ مرنج شخص ہیں۔ اچھے خاصے داستان گو بلکہ کہانی کار بھی ہیں۔ ہماری باتوں سے ذرا سا متاثر ہو کر کہنے لگے۔"میں کچھ دن پہلے اپنے ایک تاجر دوست کے ساتھ سونہ مرگ گیا ہوا تھا۔ میرے دوست کو ایک اچھی نسل کی بکری کی ضرورت تھی۔ چرواہے نے اُسے دو خوب رو بکریاں دکھا کر کہا۔"یہ بکری ۱۰۰۰ ہزار روپئے کی ہے اور اس بکری کی قیمت ۵۰۰۰ ہزار روپیہ ہے۔ دونوں بکریاں وزن اور قد میں لگ بھگ برابر تھیں"کیوں بھئی یہ دونوں ایک جیسی ہیں"؟۔ چرواہا بولا"ہرگز نہیں جناب! یہ بکری جس کی قیمت ایک ہزار ہے، ۱۰ بچوں کی ماں ہے اور یہ جس کی قیمت پانچ ہزار ہے ابھی تک ماں نہیں بنی ہے" چچا گل نے بکریوں کے مالک سے پوچھا"بھئی ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جس بکری کی کوکھ زرخیز ہے اور دس بکریوں کو جنا ہے، وہ ایک ہزار کی ہے اور جس بکری نے ایک بچہ بھی نہیں جنا، اُس کی قیمت پانچ ہزار! یہ کیسے"؟ چرواہے نے روکھا سوکھا منہ بنا کر کہا"آخر چال چلن کی بھی تو کوئی قیمت ہوتی ہے"۔

ناک، کان، آنکھ

ناک...... بظاہر یہ ایک چھوٹا سا سہ حرفی لفظ ہے۔ لیکن انسانی جسم میں یہ دوسرے اعضاء کے مقابلے میں نسبتاً اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ حالانکہ آنکھیں جو ناک کے دونوں طرف سرحدی محافظوں کے فرائض انجام دے رہی ہیں،، ناک کے مقابلے میں انہیں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو ہم قدرت کو بھی نہ جان سکتے، نہ ماں باپ کو پہچان سکتے۔ اگر آنکھیں نہیں ہوں گی تو ہمیں اندھا کہا جائے گا۔ لیکن خدانخواستہ ناک کسی وجہ سے نہیں ہوگی تو دیکھنے والوں کی نظر میں ''نکٹو'' ایک گنہگار اور مجرم سمجھا جائے گا۔ دیکھنے والے کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اس شخص کی ناک کٹی ہے یا کاٹی گئی ہے۔ کیوں......؟ وہ سوال دوسرا ہے؟ اس کے کئی جوابات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس شخص نے کوئی گناہ کیا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے، یا کوئی بے شرمی کی حرکت سرزد ہوئی ہے۔ ناک کٹ جانا ایک محاورہ ہے۔ نابینا ہونا کوئی عیب یا قصور یا پھر جرم نہیں...... اگر کوئی دیکھ نہیں سکتا، تو اس میں دو کیٹگری کے افراد آتے ہیں۔ ایک وہ جن کی آنکھیں ہی نہ ہوں یا آنکھوں کو کوئی نقص یا نقصان پہنچا ہو۔ دوسرا اندھا وہ ہوتا ہے، جسے آنکھیں ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیتا، جسے آنکھوں والا نابینا کہتے ہیں، جو اگر چار آنکھوں والا بھی ہو تو آنکھوں میں روشنی نہ ہو یا فرض کریں کہ اگر آنکھیں

بھی ہوں اور روشنی بھی ہو، تب بھی کچھ نظر نہ آتا ہو۔ایسے اندھوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔بہر حال یہ ہمارا موضوع نہیں۔اس پر کبھی تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ فی الوقت، ہم ناک پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

اگر کسی زیرک سے بھی پوچھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ناک کیوں بنائی ہے، اس کی کیا ضرورت تھی تو وہ یہی کہے گا کہ 'سونگھنے کے لئے'، کیونکہ کہ حواس خمسہ میں سونگھنے کی حس بھی شامل ہے، لیکن اگر ناک نہ بھی ہوتی تو اللہ میاں سونگھنے کی ذمہ داری کسی اور عمل کو بھی سونپ دیتے۔لیکن ناک کی تخلیق عزت اور وقار کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ماضی میں یہ عزت نفس، غیرت، خودداری اور شان کی پہچان سمجھی جاتی رہی ہے اور مستقبل میں بھی اس کی یہ اہمیت ہرگز کم نہیں ہوگی۔سیانوں کا قول ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف دیکھتا ہے تو پہلے اس کی نظر مخاطب کی ناک پر پڑتی ہے۔کیونکہ کہ انسان کے چہرے پر ایک دم سامنے اور چہرے کے مرکز میں یہی عضو ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی سچے زمانے میں کوئی چور بکریاں چرانے کے جرم میں پکڑا گیا اور وقت کے حاکم نے حکم دیا کہ چور کی ناک کاٹ دی جائے۔جب چور کو بادشاہ کے فیصلے کا پتہ چلا تو دربار میں حاضر ہو کر گڑگڑا کر رونے لگا......کہا......"مائی باپ! مجھے ہر سزا منظور ہے، میری آنکھیں نکال دیں، ہاتھ کاٹ دیں، پاؤں کاٹ دیں، زبان کاٹ ڈالیں، مگر ناک نہ کاٹیں۔میرے چہرے پر ناک نہ دیکھ کر ہر کوئی یہ سمجھے گا کہ یہ کوئی بہت بڑا مجرم اور گناہگار ہے۔اس طرح میرا سر مرتے دم تک جھکا ہی رہے گا۔مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، میں اس کے لئے شرمندہ ہوں اور رب سے معافی کا خواستگار ہوں۔آپ میری ناک نہ کاٹیں، باقی جو سزا ہوگی، مجھے قبول ہوگی۔

یوں بھی اُردو میں ایک محاورہ ''ناک کٹ جانا'' مستعمل ہے۔ عملی طور پر ناک کٹے یا نہ کٹے، لیکن محاورتاً بھی ناک کٹ جاتی ہے، یعنی بے عزتی ہو جاتی ہے۔ ناک کے ساتھ جُڑے ہوئے اور بھی کئی محاورے ہیں۔ مثلاً ناک چڑانا، ناک نقشہ، ناک کی سیدھ میں چلنا، ناک رگڑنا، اندیشہ ناک، ناک بھون چڑھانا، ناک کے آگے پیچھے سابقے اور لاحقے لگانے سے بھی ناک کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ مثلاً ''خطرناک، المناک وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی مرد یا عورت کی ناک ضرورت سے زیادہ لمبی ہو تو اس کے لئے خطرناک جیسی اصطلاح مروّج ہے۔

ناک کو اگر ہم لاحقے کے طور پر مثبت معنی رکھنے والے کسی لفظ کے ساتھ لکھتے ہیں، تو اس کے معنی منفی قسم میں بدل جاتے ہیں۔ جیسے شرمناک، المناک، غمناک، نمناک وغیرہ۔ انسان کے چہرے پر تین قسم کی ناکیں ہوتی ہیں۔ لمبی یعنی خطرناک، ستواں ناک یا دوسری قسم کی ناک اور مٹھائی ناک.......یعنی وہ ناک جو نہ ہونے کے برابر ہو۔

ناک کے زیرین علاقے میں دو سُرنگیں پائی جاتی ہیں، جنہیں نتھنے کہا جاتا ہے۔ جب چھینک آتی ہے تو انہی راہوں سے چل کر بغیر اجازت آ جاتی ہے۔ اور ان ہی سرنگوں سے ناک سے بہنے والا مادہ باہر آتا ہے۔ ناک بالواسطہ آنکھوں کے لئے مدد گار اور معاون ثابت ہوتی ہے۔ اگر بینائی کمزور ہو جائے تو اہل ناک چشمہ پہنتے ہیں اور چشمہ رکھنے کی جگہ یہی ناک ہوتی ہے۔ اس لئے چشمہ کے لئے عینک کا لفظ بھی مستعمل ہے، جو دو الفاظ کا مرکب لگتا ہے۔ عین اور ناک۔ عین عربی میں آنکھ کو کہتے ہیں اور 'نک' ناک کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ''چشمہ'' بھی چشم سے نکلا ہے۔ فارسی میں چشم کے معنی آنکھ۔ ناک کی پھُنگی پر ہر قسم کا چشمہ یا عینک بشمول دھوپ کا چشمہ رکھ کر اہل

عینک بے فکر ہو جاتے ہیں۔ ایک ماہر امراض چشم و ناک و کان ڈاکٹر سے کسی نے پوچھا........ "ڈاکٹر صاحب! اس ناک کا کیا فائدہ ہے؟ تو اُس نے بغیر رکے یا انتظار کیئے جواب دیا "ناک نہ ہوتی تو عینک کس پر رکھی جاتی۔ پوچھنے والے نے پھر پوچھا" حضرت پہلے چشمہ بنا، یا ناک"......؟ ڈاکٹر نے سوچ کر جواب دیا........ "پہلے چشمہ بنا پھر ناک........" اس ENT کے ڈاکٹر سے پوچھنے والے نے پھر پوچھا "حضرت انسانی جسم کے اعضاء میں ناک اہم ہے یا کان"؟ .... "یہ دونوں اہم ہیں" یہ جواب اس نے بہت آہستہ سے دیا یا یوں سمجھئے کہ صرف اپنے ہونٹ ہلائے۔ سوال پوچھنے والے نے پھر سوال پوچھا....... "ڈاکٹر صاحب! میں نے پوچھا تھا کہ "کان اہم ہیں کہ ناک........" .... "میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا، تم نے نہیں سنا تو اس میں میرا کیا قصور ہے" سوال کرنا آسان ہوتا ہے۔ پھر سوال پر غور سے سوچنا چاہیئے۔ تم نے کان کے بارے میں پوچھا تھا نا۔ دیکھو اردو میں کان ک+ا+ن سے لکھا جاتا ہے، اور ناک ن+ا+ک کو جوڑ کر بنتا ہے، یعنی وہی تین حروف کان میں بھی ہیں اور ناک میں بھی۔ اُلٹا کر کے پڑھا جائے تو کان کو ناک اور ناک کو کان بن جاتا ہے۔ آپ سب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کان نہ ہوتے تو ہم کیسے سُنتے؟ تو سنو، اگر کان صرف سُننے کے لئے ہوتے، تو ایک سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ پھر دو کا کیا کام؟۔ بات دراصل یہ ہے کہ خدا نے دو کان بلا وجہ یا بغیر مقصد کے نہیں بنائے۔ کسی سیانے نے صحیح کہا ہے۔ ایک کان سُننے کے لئے دوسرے سے بات باہر نکالنے کے لئے۔ یعنی ایک کان Entry کا کام دیتا ہے، تو دوسرا Exit کا۔ اگر کان نہ ہوتے تو ماسٹر جی بچوں کو کان پکڑی کیسے کرواتے۔ کان نہ ہوتے تو عینک کس پر رکھتے۔

کان ہر جاندار کے ہوتے ہیں۔ ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مچھر تک، سانپ اور

بچھو کے بھی، مگر مچھ اور اژدھے کے بھی، اُڑنے والے پرندوں کے بھی۔ڈاکٹر صاحب چرند، پرند، اور حشرات الارض عینک نہیں پہنتے تو پھر اُن کے کانوں کا کیا فائدہ؟۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا" اُن کی سماعت اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اگر دو ہزار میل دور آتش فشاں پھٹ پڑنے والا ہو تو یہ حشرات الارض اتنے زود حس ہوتے ہیں کہ زلزلہ ہونے سے پہلے یہ اس کے آنے کی خبر سُن لیتے ہیں اور ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ناک کا رشتہ چونکہ عزت اور خوب صورتی سے ہوتا ہے تو اس لئے ان دونوں خصوصیات کو برقرار اور زندہ رکھنے کے لئے ناک کی حفاظت ضروری ہے۔جب انسان بات کرتا ہے تو آواز یں مُنہ (زبان) اور ناک دونوں سے نکلتی ہے۔بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی ناک سے ہوتی ہے۔ان میں "ں" غنہ کا استعمال ہوتا ہے۔مثلاً ہیں، یوں، کیوں، آنکھیں، جاؤں، جنگ، چاند وغیرہ۔اگر ناک نہ ہوتی تو ہم تو "ماں"" کو مان" اور جاؤں کو جاؤ کہنا پڑتا۔کبھی کبھی انسان "کھونکھا" ہی پیدا ہوتا ہے اور جب وہ بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ بات ناک سے کر رہا ہے۔ایک محاورہ ہے" بلغمی طبیعت کا ہونا یا نزلی" یہ دونوں الفاظ ناک کے ناطے سے ہیں۔مغرور، غُصیلے اور بوم شخص کو "نزلی" بھی کہا جاتا ہے۔سلوتریوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی جانور کو قابو رکھنا ہو تو اس کی ناک کے آر پار رسی باندھ دی جاتی ہے۔اس طرح ریچھ، شیر اور خطرناک جانور قابو میں آتے ہیں۔اس لئے یہ ناک ہی ان کی کمزوری مانی جاتی ہے۔

سیانوں کا قول ہے "مُٹھا ناک" والے بڑے ذہین اور بہادر ہوتے ہیں۔اور لمبی ناک والے لڑاکو، جنگ باز، ہٹ دھرم.......... دوسرے، کی اچھی بات بھی نہیں مانتے۔اگر اُن سے کہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو ٹھٹے اگر اسے نہ مانیں تو وہ اپنے موقف پر آخری دم تک ڈٹے رہیں گے۔چینی، جاپانی، کوریائی، ویٹ نامی، برمی،

بھوٹانی، سکم والے اور شمال مغربی ہمالیائی خطے کے باسی ''ٹھبٹے'' مانے ہوئے بہادر اور ہٹ دھرم مانے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو داڑھی ہی نہیں آتی، اس لئے ان کی شکل وصورت عورتوں جیسی ہوتی ہے۔ القصہ ناک، کان اور آنکھیں ہی انسان اور حیوان کی پہچان ہوتی ہیں۔ خدا ہماری ناکوں کی حفاظت کرے۔ ہمارے کانوں میں اچھی باتیں آئیں اور ہماری آنکھیں ہمیشہ اچھی چیزیں دیکھیں۔ کسی نے کیا اچھا شعر کہا ہے۔

بُرائی بُری ہے میرے دوستو
بُرا مت دیکھو، بُرا مت سنو اُبُرا مت کہو

بچپن

کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن

نیپولین ہل کو کسی نے پوچھا کہ اگر تجھے خدا پر یقین ہے اور تم مانتے ہو کہ تم خدا سے جو کچھ بھی مانگو گے تو وہ تم کو دے دے گا، تو بتاؤ تم اُس سے کیا مانگو گے؟ نیپولین نے تھوڑا سوچنے کے بعد کہا "میں اُس سے مانگو گا کہ خدایا مجھے میرا بچپن واپس لوٹا دے"۔

نیپولین ہل ایک عظیم مفکّر دانشور اور ماہرِ علمِ نفسیات تھا۔ اُس کی ساری عمر غربت میں بسر ہوئی۔ اُس نے کبھی دولت اور جھوٹی شہرت کی تمنا یا خواہش نہیں کی، بلکہ ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھے، جو محبت، امن اور مسکراہٹوں کا گہوارہ ہو۔ یہ تینوں چیزیں اُسے صرف ایک "بچے" میں نظر آئیں۔ بچہ، جو ہر قسم کی لالچ نفرت، حسد، بغض، دشمنی سے پاک اور مبرا ہوتا ہے۔ کسی مفکر نے اُسے ایک کلین سلیٹ یا کاغذ کا ایک ایسا ٹکڑا کہا ہے، جو صاف ہو اور اُس پر کسی قسم کی تحریر نہ ہو۔ نفسیات کے ماہر فرد بل کا کہنا ہے کہ وہ "مصوّر" کے بُرش سے بنایا ہوا ایک ایسا نقشِ گل ہوتا ہے، جس میں کوئی رنگ بھرا نہیں ہوتا، بلکہ اس نقش میں خوبصورت رنگ بھرنے کے بعد ہی یہ ایک نمایاں پُرکشش تصویر

میں بدل سکتا ہے۔ مانٹی سوری کہتی ہیں کہ ''بچہ'' ایک تازہ انڈے کی طرح ہوتا ہے۔ اس انڈے کو فرائی کرنے یا اُبالنے کے بعد اس کی ہیئت بلکہ دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ اگر آپ اسے پھر اپنی اصلی پیدائشی صورت میں لانا چاہیں تو قطعی ناممکن ہے''۔

''بچے'' کی معصومیت پاکیزگی اور پیار.........اس کی شخصیت میں تب تک جھلکتی رہتی ہے، جب تک کہ وہ بچہ رہتا ہے۔ خواہ وہ کسی محل میں، کسی شہنشاہ کے گھر میں پیدا ہوا ہو، یا کسی غریب کے جھونپڑے میں.........وہ ہر ایک کو پیارا لگتا ہے۔

انگریزی کا ایک محاورہ ہے''

ایک حقیقت، جسے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں...........یہ ہے کہ لمحۂ ولادت سے ہی ہر ذی روح کی عمر گھٹنا شروع ہو جاتی ہے.........یہ کاؤنٹ ڈاؤن کب اختتام تک پہنچے گا، اُس کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ والدین خوش ہوتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو رہا ہے۔ لیکن اُس کی زندگی کا ہر سیکنڈ اُس کی عمر سے تفریق ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی انسان کی زندگی کا یہ سب سے سہانا، خوش گوار اور خوب صورت دَور ہوتا ہے۔ اس دَور میں بچہ پیار اور کشش کی علامت اور معصومیت و پاکیزگی کا مجسمہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی کہانی کا عنوان ہوتا ہے.......جس کا آغاز رونا ہوتا ہے اور کلائمیکس المیہ............

یہ بچہ بڑا ہی بھاگیہ وان اور قسمت والا سمجھا جاتا ہے، جو اپنی پیاری ماں کی لوری برسوں تک سُن سکتا ہے اور اس لوری کے ذریعے وہ ماں کی دعاؤں، محبتوں اور خوابوں کی سوغات روح میں بسا کر میٹھی نیند سو جاتا ہے۔ بچہ بڑوں کا کھلونا اور اُس کا بچپن، اُن کی زندگی کی دہلیز.........یا رہ گزر پر رکھا ہوا چراغ.........جس کی روشنی میں وہ اپنی منزلوں کا تعین کرتے ہیں۔ بعض ماہرینِ لسانیات کی رائے ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کا بچپن پھر لوٹ آتا ہے۔ بڑھاپے اور بچے میں بعض باتیں چونکہ یکساں

اور ایک جیسی ہوتی ہیں، اس لئے بچے اور بوڑھے غذا اپنی مرضی سے نہیں کھا سکتے، کیونکہ اُن کے منہ میں دانت نہیں ہوتے۔ بچوں کو اُن کے والدین اور بوڑھے والدین کو اُن کے بچے ہاتھ پکڑ کر اِدھر اُدھر چلنے میں مدد کرتے ہیں.........نہ بچے کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ بوڑھے۔ بچے اور بوڑھے دونوں توتلی زبان میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں کو ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔.........جو صرف خوش قسمت بچوں اور بوڑھوں کو نصیب ہوتی ہے، اُسے بوڑھا بچہ کہنا مناسب ہوگا۔

بچپن خالق کا سب سے انمول تحفہ ہے، جو کسی کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ عطا کیا جاتا ہے۔ شاعر بچپن کے بعد آنے والے اُس عہد کے بارے میں کہتا ہے۔

یہ دنیا عجب رادِ فانی دیکھی
ہر چیز یہاں آنی جانی دیکھی
آ کر جو نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جا کر جو نہ آئے وہ جوانی دیکھی

بچپن کی یادیں بے حد میٹھی ہوتی ہیں۔ جس سے ایک عجیب نشہ اور سرور آجاتا ہے اور آدمی پھر سے ایک بار بچہ بن جاتا ہے اور اپنا انگوٹھا چوسنے لگتا ہے، جب کہ اُس کے چہرے پر معصومیت اور محبت کے ملے جلے رنگ اُبھر آتے ہے۔

زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام.........وہ پھر نہیں آتے

ایک لڑکی نے اپنے بوڑھے باپ سے پوچھا.........''ابو آپ سوتے کیوں نہیں؟ آپ بستر پر لیٹے ہوتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے، کیا آپ کے لئے خواب آور گولیاں لے آؤں''؟۔ بوڑھا باپ مسکرایا اور بیٹی سے بولا ''پتہ نہیں مجھے نیند کیوں نہیں آتی.........لگتا ہے ''نیند'' میری آنکھوں سے

روٹھ چکی ہے، سوچتا ہوں اگر میری ماں زندہ ہوتی تو وہ میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر میرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے کنگھا کرتی اور لوری گنگناتی، سر پر ہاتھ رکھ کے کہتی ''بیٹا اللہ تیرے ساتھ ہے......سو جا راج دُلارے سو جا...... آنکھ کے میرے پیارے سو جا......میری ماں تجھ پہ واری...... تجھ واری دنیا ساری......سارے جگ کے آنکھ کے تارے، میرے راج دُلارے سو جا......... اللہ ہُو...... اللہ ہُو ہُو ہُو۔ مجھے دوا کی گولی کی ضرورت نہیں ہوتی'' میری ماں کے پیارے ہونٹوں سے نکلے لوری کے الفاظ ہی میرے لئے دل و دماغ کا سکون ہوتے تھے، جس سے مجھے چین کی نیند آجاتی تھی......کاش! میرا بچپن واپس لوٹ آتا ......میری ماں زندہ ہو کر مجھے لوری سُناتی.........اس عمر میں دوا بے کار ہے، کیا تم نے یہ شعر نہیں سُنا ہے؟

پہلے بھی یہی ہتھیلی تھی، اب بھی یہی ہتھیلی ہے
پہلے اس سے مٹھائی گرتی تھی اب دوا گر جاتی ہے

میری زندگی کا سفر گھڑی کی سوئی کی طرح ایک ہندسے سے شروع ہوا تھا، اب سوئی وہیں پہنچ رہی ہے۔

چور

''چور'' ....اردو کے تین حروف کا مرکب ہے،لیکن ضمیرِ ذات اور صفت کے لحاظ سے یہ یوں بھی چار حروف'' کا ہم معنی لفظ (محاورتاً) لگتا ہے۔ یہ خالص ہندوستانی لفظ ہے اور ملک کی ساری ریاستوں میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ چور کی مختصر تعریف یہ ہے جو''چوری'' کرتا ہو۔ یہ ''چوری'' کیا ہوتی ہے؟ جو چور کرتا ہو،لہذا یہ چوری صفتِ نسبتی ہے اور خود چور اسم .... یا یوں سمجھ لیجئے کہ چوری ''فعل'' ہے اور وہ بھی فعلِ بد اور چور اسمِ فاعل ....لازماً ''چوری'' کو چور کا مونث ہونا چاہئے تھا،لیکن اس کے لئے ''چورنی'' کا لفظ قرار پایا ہے ....اگر چور کی مفصّل تعریف کی جائے تو اس کے لئے کئی گھنٹے (اگر تعریف کی جائے تو کئی صفحات ......اگر تعریف لکھی جائے) تو سالہا سال درکار ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنے اہم پیشے کا نام ہے۔

اس اہم پیشے کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے اہم اہم ہستیاں جُڑی ہوئی ہیں ....اگر اُس کا خلاصہ کیا جائے تو انتہائی حیرت انگیز اور چونکا

دینے والے حقائق سامنے آتے ہیں مثلاً حاکم.....محکوم......اُمراء......فقراء ....
اور جن کے نام یا پیشے کے آگے 'دار' کا لاحقہ لگتا ہو، جیسے زمین دار ......سرمایہ دار......ٹھیکے دار......تھانیدار وغیرہ، حتیٰ کہ مذہب.....سیاست ......تجارت سے وابستہ حضرات بھی اس اہم کام کی آبیاری کر رہے ہیں۔ حرمینِ شریفین کے حدود کے اندر بھی ایسے "مقدس ومحترم حضرات" پائے جاتے ہیں، جو اس فعل کے ارتکاب سے پہلے مقدّس جیسا سابقہ استعمال کرنے سے بھی نہیں چُوکتے۔

چور ہر دور اور ہر زمانے میں ہوئے ہیں۔..........عالمِ وجود اور ظہورِ آدم سے لے کر آج زمین کے چپے چپے پر یہ موجود رہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ لوگ زندگی کے ہر شعبے سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حسبِ مراتب اُن کے درجات مرتّب کیے جاتے ہیں..........جو جتنا بڑا چور ہوتا ہے، اُس کی عزت و تکریم اُس کے درجے کے مطابق ہوتی ہے۔ معمولی چوری کرنے والے کو سب لوگ حقارت سے دیکھتے ہیں ....اُسے نیچ، کمینہ اور احمق کہا جاتا ہے۔ بڑی بڑی چوریاں کرنے اور وہ بھی سینہ زوریاں کرنے والا چور سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے.......عوام اُس کے حق میں نعرے بلند کرتے ہیں، مالائیں پہناتے ہیں، اُن کو بڑے بڑے ایوانوں تک پہنچایا جاتا ہے........ جہاں اُسے اپنا پیشہ بے خوف وخطر جاری رکھنے کا بھرپور موقع ملتا ہے، البتہ ایسے ایوانوں میں اُن کو بھی "مقابلے" کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیونکہ وہاں اس برادری کے لوگ پہلے سے ہی ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہوتے ہیں ....جن کی گاڑیوں پر لال بتیاں اور انجن کے آگے فلیگ لگے رہتے ہیں.........اُن کی حفاظت کے لئے آگے پیچھے کئی گاڑیاں ہوتی ہیں، جن میں بیٹھے ہوئے اُن کے ہم پیشہ لوگ اُنہیں سلیوٹ مارتے ہیں........حتیٰ کی اُن کی

گاڑیوں کی کھڑکیاں تک بھی وہی کھولتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ کام ایک لعنت اور ذلیل حرکت کے زمرے کا مانا جاتا تھا، لیکن دورِ حاضر میں ہر انسان کا اس سے سابقہ پڑتا ہے.........خواہ فاعل کے طور پر یا مفعول بن کر.........موجودہ دور کا انسان اور یہ پیشہ لازم وملزوم ہو کے رہ گئے ہیں۔ چوراہے پر بیٹھا ہوا چوراسی سالہ چور ہو یا سرکاری کُرسی پر براجمان ۵۸ سالہ تجربہ کار چور.........اول الذکر کے قبیل سے ۲۰ سالہ دوشیزہ بھی آتی ہے اور دس ۱۰ سال کی عمر کا معصوم، جو صرف اُن لوگوں کی جیبیں کاٹتے یا صاف کرتے ہیں، جن کی جیبوں میں چند سکے پڑے ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ سرکاری افسر، جو عوامی خزانے کو لُوٹتے ہیں.........جن کی وجہ سے امیر بھی لُٹتے ہیں اور غریب بھی.........سردار بھی لُٹتے ہیں اور نادار بھی.........اس لفظ کے ساتھ جو ترکیبات اور اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں، وہ اہلِ زبان جانیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ چوری چکاری، چوری سینہ زوری، چوری ہیرا پھیری، چوری یا مجبوری.........

.........اہلِ زبان کی بات چلی، تو اس کے حوالے سے اُن چوروں کا ذکر کرنا ضروری بن جاتا ہے، جو اپنے آپ کو شاعر کہلوانے کے لئے دوسرے گُمنام قسم کے شعراء کے کلام میں ماہرانہ ہیرا پھیری کر کے اپنے نام سے منسوب کر لیتے ہیں، بلکہ یہ اتنے ڈھیٹھ چور ہوتے ہیں کہ دوسروں کی غزلیں اپنے نام سے چھپواتے اور مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔

چور کے بارے میں ایڈورڈ ہیتھ کا خیال ہے کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت ذہین اور عقلمند ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایسے ہی ایک شاعر کی دانائی اور ذہانت کی بات لکھی ہے، جو اتنا مشہور تھا کہ اپنی ذہانت اور کارناموں کی وجہ سے ایک راجہ کا درباری اور مشیر بن گیا۔ اُس نے راجہ سے کہا کہ وہ اُس کے کپڑے چُرا لے گا، جو

راجہ نے پہن رکھے ہوں۔ راجہ نے اُس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اُس کا پہنا ہوا لباس چُرائے گا تو اُسے انعام سے نوازا جائے گا۔

چنانچہ چور ایک رات راجہ کی خواب گاہ میں آتش دان کے راستے اُترا۔ چور اپنے ساتھ چیونٹیوں سے بھری ایک تھیلی ساتھ لایا تھا۔ راجہ کے پلنگ کے پاس پہنچ کر چور نے چیونٹیوں سے بھری وہ تھیلی پلنگ کے اوپر کھول دی اور خود کمرے کے کونے میں کھڑا انتظار کرنے لگا۔ چونٹیاں راجہ کے کپڑوں کے اندر گھس کر اُسے کاٹنے لگیں۔ راجہ خود کو کُھرچ کُھرچ کر تنگ آ گیا۔ اُس نے اپنے کپڑے ایک ایک کر کے اُتار کر کونے کی طرف پھینکے............ چور نے راجہ کے کپڑے جمع کر لئے اور روشن دان کے راستے باہر آ گیا۔ اگلے دن راجہ کے کپڑے دھو کر اُنہیں اِستری کر کے راجہ کو اُس وقت پیش کئے، جب وہ دربار میں بیٹھا تھا۔ راجہ چور کی ذہانت پر بہت خوش ہوا اور اُسے اپنا درباری بنا دیا۔ چور نے آئندہ چوری کرنے سے توبہ کر لی اور ایک نیک شہری بن گیا۔

ایک اور چور ایسا بھی تھا، جس نے اپنا شیوہ کچھ اس طرح بنا لیا تھا کہ وہ دن بھر امیر لوگوں کے جیب کاٹتا، رات کو گھروں میں چوریاں کرتا..................وہ جو کچھ چُراتا، اُسے غریبوں، مسکینوں، نادروں اور بے آسرا لوگوں کو امداد کے طور پر دے جاتا۔ چوروں کے اقسام میں ایک ایسا چور بھی تھا، جو بھکاریوں کے پیسے چُراتا تو تھا، مگر دوسری جانب وہ جسمانی طور سے معذور بھکاریوں کے کشکول میں ڈال دیتا۔

قصائی

یہ لفظ سُنتے ہی شریف آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کے بدن میں تھرتھراہٹ اور رعشہ سا طاری ہوتا ہے۔ موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آتی ہے............ آنکھیں کھولتا ہے تو ہر سو سُرخ ہی سُرخ دِکھتا ہے۔ زمین، پودے، جانور، انسان حیوان حتیٰ کہ آسمان کا نیلا رنگ بھی سرخ نظر آنے لگتا ہے۔ آگے، پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے............ چُھریاں اور خون آلود چاقو رقصاں نظر آتے ہیں۔ چُھری کبھی حلق پر............ کبھی دل کی طرف رُخ کر کے سینے پر.......... دل نوحہ کُناں ...... آنکھیں اشکبار...... ہونٹ گُم سُم مگر درمیانِ دہن زبان پر اپنے لئے دعاؤں کا وِرد جاری............ اپنے خیر خواہوں کے لئے ...... دنیا جہاں کے لوگوں کے لئے .... اتنا بڑا انفسیاتی انقلاب برپا ہونے کی وجہ کوئی آفتِ سماوی نہیں، بلکہ صرف ایک لفظ جو سُننے میں آتا ہے "قصائی"، یعنی قصاب یا قصاص کا صفتِ نسبتی .... پتہ نہیں جو ہے سو ہے......اور وہ ہے قصائی.......... میری قوتِ مردانگی کی داد دیجئے کہ میں نے یہ جان لیوا اور ہولناک لفظ نہ صرف کئی مرتبہ سُنا بھی ہے، بلکہ اسمِ مجسّم و مفرد

........اسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔ کبھی اس کے دونوں ہاتھ خالی دیکھے ....کبھی تیز دھار والا رامپوری یا مقامی چُھرا اور جس کی مونث کو چُھری کہتے ہیں، لیکن وہ بھی کاٹ کُٹائی میں چُھرے سے کم نہیں۔ یہ ہے سماج کا وہ فرد،، جسے لوگ قصائی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کے پیشۂ خون خرابہ کے سبب جب بھی اس پر نظر پڑتی ہے........زبانِ حال سے آیت الکرسی کا وِرد جاری ہو جاتا ہے اور آپ ہی آپ خود پر دَم کرتا ہوں اور اس سبب سے مقدس آیات پڑھ کر اُس کی طرف پھونکتا ہوں کہ کسی طرح آئی بلا ٹل جائے اور اپنے علاوہ دشمنوں کے حق میں بھی دعا کرتا ہوں کہ خدا اس عفریت سے سب کو محفوظ رکھے۔ قصائی کو اچانک دیکھ کر نجانے میرا ہاتھ کیوں اپنے حلق کو سہلانے لگتا ہے.......اُس وقت مجھے اپنے حلق کے اندر کچھ گد گدی سی محسوس ہوتی ہے.........بمشکل تھوک نگلنے کے بعد اُس وقت تک آنکھیں میچ کے رکھتا ہوں، جب تک محسوس نہ ہو کہ قضا ٹل گئی۔ خُدا کا شکر ادا کر کے سوچنے لگتا ہوں کہ اُس نے مجھے بھیڑ، بکری، گائے، بھینس یا مُرغا بنا کے پیدا نہیں کیا۔ اگلے زمانے میں ''قصائی'' یا ''قصاب'' خال خال ہی نظر آتے تھے..........اور وہ بھی اپنی ''دکان'' کی چھٹی پر........لیکن زمانہ اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے کرتے جب بہت آگے بڑھا تو مختلف سمتوں میں اس کے بھی پَر نکل آئے، جس کے نتیجے میں یہ ''حضرات'' اب بازاروں میں، سڑکوں پر، گلی کوچوں میں.......میدانوں میں، دکانوں میں، شفاخانوں میں، تھانوں میں، نمک اور کوئلے کی کانوں میں ....خشم ناک آنکھیں .... تاؤ بھری مونچھیں، خشخشی داڑھی، خون آلود ہاتھ، گریبان اور آستین بھی لال، چہرے پر اُبال، تنی ہوئی کھال، چاروں طرف مال، عالم کے لئے اُبال۔ زندوں کے لئے وبال.........

میرے ایک دوست نے ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا۔ وہ اپنے لختِ جگر کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ بیٹے نے باپ کی انگلی بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ اچانک بچے کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ باپ نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا.......... "کیا ہوا میرے لال؟ میرے جگر کے ٹکڑے!.........میں قربان جاؤں ....میں صدقے جاؤں، کیا ہوا؟!"۔ "وہ.....وہ...وہ........" بیٹے نے ڈرتے ڈرتے انگلی سے ایک شخص کی جانب اشارہ کیا، جس کے ہاتھ میں چُھری تھی اور ہاتھ خون آلود.....چُھری کا رُخ مخالف سمت میں تھا.........."وہ کیا ہے.......وہ وہ!؟" "قصائی بھائی ہے......."؟.........."یہ قصائی بھائی کیا ہوتا ہے ابو!" "ارے وہی جسے ہم قصاب کہتے ہیں"......"اس کے ہاتھ میں چُھری کیوں ہے"؟۔ یہ قصائی جو آپ کا بھائی ہے، چاقو کا کیا کرے گا"؟......."اس چُھرے سے وہ حلال جانوروں کو کاٹتا ہے، پھر اُن کا گوشت بیچتا ہے، جسے سب لوگ کھاتے ہیں اور ہم بھی خرید کر کھاتے ہیں"۔........"بیٹے نے پوچھا" قصائی انکل جانوروں کو کیوں کاٹتا ہے، اُن کا قصور کیا ہوتا ہے"؟ "یہ تو زمانے کا دستور ہے بیٹا!.......اصل میں اللہ نے اِن جانوروں کو اسی لئے پیدا کیا ہے"۔ یہاں مجھے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات "یادوں کی بارات" سے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جوشؔ نے لکھا ہے کہ اُس نے شوقیہ طور پر ایک بکرا پال رکھا تھا.......سکول جاتے اور آتے وقت وہ اُس بکرے سے کھیلتا.....اسے بکرا بہت پیارا لگتا تھا۔ ایک دن اُس نے دیکھا کہ اُس کے محلے کے قصائی نے اس بکرے کو پکڑ کے رکھا ہے اور رام پوری چُھرے کو ریتی پر تیز کر رہا ہے۔ جوشؔ نے باپ سے پوچھا۔ "ابو یہ انکل میرے بکرے کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہے.......میرا بکرا میاں میاں کر رہا ہے، یہ کیوں رو رہا ہے"؟۔

”ابھی دیکھتے جاؤ....آگے کیا ہونے والا ہے“باپ نے جواب دیا۔اُس کے بعد کیا ہوا، وہ ناقابلِ بیان ہے۔قصائی نے بڑی بے رحمی سے بکرے کو لٹا کر، ٹانگیں باندھ کے اُس کے گلے پر چُھری پھیر دی۔بکرے کے گلے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا، وہ تڑپنے لگا.......آں آں ماں ماں کر کے اُس نے دم توڑ دیا، اُس کی آنکھیں کُھلی اور ساکت ہو کر رہ گئیں۔”یہ کیا!؟....تم نے میرے بکرے کو مار ڈالا“۔جوشؔ نے قصائی کے پیٹ پر زوردار مُکہ رسید کیا......ارے ظالم یہ تو نے کیا قہر ڈالا۔میرے پیارے بھائی جیسے بکرے کو مار ڈالا.......میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا“۔جوشؔ کے والد نے جوشؔ کو پکڑ لیا۔”شبیر چھوڑ! دو قریشی صاحب کو،اس کے ساتھ گستاخی مت کرو......بدتمیز“۔

”تم لوگوں نے میرے بکرے کو کیوں مار ڈالا، جواب دو“؟ جوشؔ نے پھر ....اشتعال بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ارے پاگل! یہ بکرا اچھے کام آیا......اچھے رستے پر گیا......اللہ کو پیارا ہو گیا.......یہ اللہ کے حکم سے قربان ہوا۔

”مگر کیوں!،اس نے کس کا کیا بگاڑا تھا........قربانی دی اس کی.....آخر کیوں؟ ......قریشی انکل اچھی راہ پر نہیں گیا“۔

”ارے یہ اللہ کی مرضی ہے........یہ اللہ کا حکم ہے،خدا اس عمل سے خوش ہوتا ہے“۔جوشؔ کا کہنا ہے کہ اچانک میرے دماغ میں اللہ کی تصویر اُبھر آئی۔میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔میں نے سُنا اور پڑھا تھا کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے.........وہ رحیم ہے، کریم ہے اور مہربان ہے......اُسے قصائی جیسا ظالم تو نہیں ہونا چاہئے.......یہ تصوّر کر کے میری آنکھوں کے سامنے دو تصویریں اُبھر آئیں، ایک یہ کہ میرے ابو کا خدا یا تو تھانیدار جیسا ہو گا یا پھر ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر جیسا ......”یہ

قریشی انکل آخر قصائی کیوں بن گیا؟.........نائی یا نان بائی جیسا کیوں نہیں''؟۔

میرے سوالوں کا جواب مجھے دھکوں کی صورت میں مل گئے۔ پتہ نہیں جوش کا قصابوں سے متعلق نظریہ یا خیال بدلا یا نہیں، لیکن میں اس سچائی سے سمجھوتہ نہ کر سکا کہ یہ پیشہ ہرگز اور ہر رنگ میں کسی صورت میں اچھا اور قابلِ ستائش نہیں.........اگر صرف اپنے لئے کسی جاندار کو مار ڈالنا ہوتا تو گنجائش نکلتی ہے۔ ہفتے میں یا مہینے بعد ایک آدھ جانور کو ذبح کرنا ہو، تو ٹھیک ہے، لیکن فروخت کرنے کے لئے دن میں درجنوں جانور وں کا گلا کاٹنا........ یہ جوازیت حلق سے نہیں اُترتا۔ قصائی خواہ اَن پڑھ ہو، جاہل ہو یا تعلیم یافتہ، بہر رنگ ''ڈسکوری چینل'' کا کردار لگتا ہے۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے، قصائی بھی بنا ہے۔ پہلے قصائی بھی آدمی ہی تھا، لیکن پیٹ کی خوراک نے اسے قصائی بنا دیا۔ ہم نے تواریخ اور تذکروں میں اِن کا ذکر پڑھا ہے۔ کئی آدم خور'' آدم'' ایسے گزرے ہیں، جنہوں نے ہر ذی روح کا خون پیا ہے، اُن کا گوشت کھایا ہے........ کلیجہ چبایا ہے، ایسے.....جیسے وہ خون نہ ہو، کوئی شربتِ روح افزا ہو، کسی نہ کسی جاندار خون سے اپنی پیاس بجھائی۔ گوشت سے بھوک مٹائی۔

آدمی ماساہاری اور شاکاہاری بھی رہا، درندہ اور حیوان بھی.........لیکن ماساہاری سے بہتر شاکاہاری چوپایہ ہے۔ ایسے آدمی بھی ہیں جو ہری گھاس بھی کھاتے.........سوکھی گھاس سے ہی اپنا شکم سیر کر لیتے ہیں۔ ذکر قصائی بھائی کا چل رہا تھا۔ جب چُھری کسی غیر انسانی مخلوق پر چلائی جاتی ہے تو اُس عمل کے دوران اللہ کا نام لیا جائے تو چُھری چلانے والا، باعزت بری ہو جاتا ہے، ایسے عمل کو اللہ کی مرضی سے موسوم کیا جاتا ہے اور مہلوک کو شہید یا حلال کہا جاتا ہے۔ اگر خدا کا نام نہ لیا جائے اور غیر انسانی مخلوق کا گلا اُس کے جسم سے جُدا کیا جائے تو اُسے جھٹکا کہا جاتا ہے۔

ماساہاری یا گوشت خور ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ عدمِ تشدّد اور چیونٹی تک کو نہ مارنے والے بودھ تک کسی نہ کسی بہانے جاندار کا خون پی جاتے ہیں اور گوشت کھا جاتے ہیں..........ایک پنڈت جو اپنے نام کے آگے ویشنوی لکھواتا تھا، سے کسی نے پوچھا۔

''پنڈت جی! پیاز کھاتے ہو''!

''ہری ہری ہری'' پنڈت کا مختصر جواب تھا۔

''پنڈت جی! ماس کھاتے ہو''؟

''سری، سری، سری'' دوسرے سوال کا جواب تھا۔

''پنڈت جی! شراب پیتے ہو''؟

''رام، رام، رام..........یعنی رم، رم، رم''

ان حالات اور واقعات کو پیش نظر رکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ قصائی کو قتل کرنے کا باضابطہ لائسنس ملا ہوا ہے۔ وہ کسی دفعہ کی زد میں نہیں آتا اور حوالدار بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر گوشت ذرا مہنگا یا کم تولے تو کوئی نہ کوئی دفعہ اُس پر لگ جاتی ہے۔ جب اُسے تھانیدار کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو وہ کسی دفعہ کی رو سے ۱۰۰، ۵۰۰ یا ۱۰۰۰ کی رقم جرمانے کے طور پر دے کر بری ہو جاتا ہے۔ جتنا بڑا جرم اُتنی بڑی دفعہ عاید کی جاتی ہے۔ اس طرح جوش ملیح آبادی کے باپ یا قصائی بھائی پر قانون کی کوئی دفعہ نہیں لگتی.........، کیونکہ یہ ''قتل'' اللہ کی رضا جوئی، خوشنودی اور اُس سے قریب تر ہونے کی ضمانت دیتا ہے اور خدا کی رضا جوئی کے لئے جو چھُری چلائی جائے، مقدّس کہلاتی ہے۔

ننگا درزی

اشتراکی نظریہ رکھنے والوں اور ترقی پسند ادیبوں کی شکایت رہی ہے کہ دُنیا بھر میں ......کسان اور زرعی مزدور پیٹ پر پتھر باندھ کر دُنیا والوں کی شکم سیری اور کام سر انجام دیتے ہیں اور خود فاقہ کشی سے مر جاتے ہیں ۔ جان لیوا سردی ہو یا سلگتی گرمی، غریب اور ادھ ننگے مزدور کے جسم سے لپٹی ہوئی کھال کو جھلسا دینے والی دھوپ سوکھی لکڑی کی طرح جلا دیتی ہے............ بُنکر ......جو ساری دنیا کے لئے ہر قسم کے کپڑے بُنتے ہیں،، اُن کے بدن پر ایک دھاگہ بھی نظر نہیں آتا۔ فلک بوس عمارتیں تعمیر کرنے والے یا تو جھگی جھونپڑیوں میں بھی پاؤں پسار کر سو نہیں سکتے ، یا سڑکوں یا پارکوں پر بھی اُنہیں گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کرنے نہیں دیا جاتا۔

سو جاتے ہیں فُٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

کھیتوں، کھلیانوں کی منڈیروں پر سانپوں اور بچھوؤں پر گھاس کے تنکوں کا بچھونا بنا کر سو جاتے ہیں ....جنگلوں میں رہنے والے سیٹھوں اور آسودہ حال اور بارسوخ لوگوں کے لئے ہرے بھرے درختوں کو کاٹ کر اُن سے تعمیری لکڑی تیار کر کے دیتے

ہیں..........وہ کثیر المنزلہ مکانوں میں رہتے ہیں، لیکن اُنہیں تعمیراتی لکڑی فراہم کرنے والے مٹی اور گھاس کی چھتوں والی جھونپڑیوں اور جگہوں میں ساری عمر بسر کرتے ہیں۔ کھیت مزدوری سے کچھ ملا تو ملا ورنہ یہ فاقہ کش بچوں کو دلاسہ دیتے دیتے چند گھڑی سونے کے تہمت بردار بن جاتے ہیں۔

بھوک بچوں کی چڑھا کے چولہے پر
لکڑی لکڑی سُلگ رہی ہے ماں

یہ باتیں سب جانتے ہیں.......لیکن ان کا اظہار یا پھر کوئی ترقی پسند ادیب کرتا ہے یا اشتراکیت پسند رہنماء.........وہ بھی لیڈر تب بنتا ہے، جب اُس کی انتڑیاں مارے بھوک کے قُل ھو اللہ پڑھنے لگ جائیں..............یا شکم سیروں کو ڈکارتے دیکھیں اور سُنیں۔ اور پھر ایسا شعر موزون ہو جائے۔

شکم سیرو ذرا قابو میں رکھو تم اپنی ڈکاروں کو
کسی بھوکے نے پیٹ سے پتھر نہ باندھ رکھے ہوں

ننگے، سوکھے سڑے ہڈیوں کے ڈھانچوں والے بچے اُن ہاتھوں پر نظریں جمائے رہتے ہیں، جن میں کیلا یا کیلے ہوں۔ کھانے والا جوں ہی چھلکا اُتار کر پھینکتا ہے، کئی بچے اس چھلکے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ کیلے کے باغ کے مالک کو ڈاکٹر نے کیلا کھانے سے منع کر رکھا ہے، کیونکہ وہ ذیابیطس کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔

میں نے ایک ایسے آدمی کو لنچ کرتے ہوئے دیکھا جو پچپن رولر نجنوں کا، سات جے، سی، بی، چار سینما گھروں، ایک تھری سٹار ہوٹل اور دو پیٹرول پمپوں کا مالک ہے۔ اس حاجی صاحب نے جب ٹپن کھولا تو اس میں دو سوکھی روٹیاں بینگنوں کا بھرتہ ۲۰ گرام، کھیرے کے چند قاش اور پیاز کے دو تین ٹکڑے۔ میں نے حاجی صاحب کی

ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا اور پوچھا ''حضرت آپ لنچ بہت مختصر کرتے ہیں'' حاجی صاحب نے فرمایا..... ''میں شوگر کے علاوہ پراسٹیٹس اور تھائرائیڈ کا مریض ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے مُرغن غذائیں کھانے سے منع فرمایا ہے'' لنچ کے بعد حاجی صاحب نے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ کھولا اور اس میں سے مختلف قسم کی گولیاں نکال کر کھائیں۔''دن میں دو مرتبہ ۱۴ گولیاں کھاتا ہوں''......۔ے مختلف قسم کی گولیاں نکال کر کھائیں۔پھر خود ہی کہا'' دن میں دو مرتبہ ۱۴ گولیاں کھاتا ہوں۔ان میں سے ایک کیپسول ۳۰ روپے میں آتا ہے۔کُل ملا کر ۶۰ روپے کی ادویات ایک ڈوز کے طور پر کھانا پڑتی ہیں، جب کہ ایک وقت کا کھانا بمشکل پانچ روپے کا لیتا ہوں۔

میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا، جس کی دونوں آنکھیں ایک دم بھلی چنگی دِکھتی تھیں، لیکن اُن میں نور نہیں۔اس اندھے شخص کا نام منوّر زمان ہے۔ایک چھ انچ زبان (دراز) والے کا نام داؤد ہے، جو بچپن سے گونگا تھا۔اردو کے اس محاورے کو کئی مرتبہ سُنا، کہا اور دیکھا کہ پڑھے نہ لکھے ......نام مولانا عالم۔میں ایسے کئی دوستوں کو جانتا ہوں، جن کا حلیہ کچھ اس طرح ہے ......سارے چہرے پر چیچک کے داغ اور دھبے ،ایک آنکھ سے عاری، چہرہ توے جیسا سیاہ، اگلے پانچ دانتوں سے فارغ، لیکن نام یوسف......مکھی اور دیمک سے بھاگ جانے والا رُستم ......کسی محتاج اور مسکین کی ہتھیلی پر ایک پیسے کا سکہ رکھنے میں کنجوسی برتنے والا نام کا حاتم طائی.........۔

حکومت کے ایوانوں میں پائے جانے والے عمر اور عادل، ایماندار، انصاف پرور اصحابِ اقتدار.........آج کی تاریخ میں دیو مالائی قصے کہانیوں کے کردار، جیسے سندھ باد جہازی، پیرِ تسمہ پا، الہ دین کا جن، دیو سفید اور حُسن بانو پری، جادوگر حسینہ، گُلِ بکاؤلی، گُلِ صنوبر.....شاہ پری ہو یا دانا وزیر، ظالم بادشاہ اور نیک سیرت و نیک صورت

ملکہ.........اِن کرداروں سے جُڑی ہوئی داستانیں بھی سچی ہیں۔ کاکوسین ماؤنٹین (کوہِ قاف) جوکل تک ایک فرضی داستان کا مرکز سمجھا جاتا تھا.......اب ایک پکنک سپاٹ بن چکا ہے، جہاں دوسوسال کے بوڑھے اور بوڑھی آرمینی اور اُزبک مرد اور خوانین اُن قدیم داستانوں کے مذکور گھوڑے اور گھوڑیوں پر سوار ہو کر اُن گھنے جنگلوں میں انگور کھانے کے لئے جاتے ہیں.......جہاں پریاں جنوں کی مہمان بن کر جاتی تھیں۔ تاشقند اور اُس کے قرب وجوار میں رہنے والے اور والیاں......ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان کے لحاظ سے آج بھی الف لیلیٰ کے زمانے کے کردار ہی لگتے ہیں۔ یہاں کے علی بابے اور چالیس چور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں.........اُن کے ساتھ ہمکلام ہونے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ ہر چند کہ وہ ہم سے اور ہمارے دیس سے ۱۰ ہزار سال آگے ہیں، تاہم وہاں کے لوگ آج تک وہی زندگی بسر کر رہے ہیں، جس میں ایڈوینچر ہی ایڈوینچر ہیں۔ ایک امریکی سفیر کے نگ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے.......کہ اُس نے کوہِ قاف کے خوبصورت پہاڑی سلسلے میں ایک پانچ ہزار سال پرانے درخت کے نیچے ایک بوڑھے بزرگ کو بیٹھے روتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اُس سے پوچھا "بابا آپ کو کیا تکلیف ہے، آپ کیوں رو رہے ہیں"؟ بزرگ شخص نے آنسو پونچھتے ہے کہا" مجھے میرے پاپا نے مارا ہے"۔ آپ کے پاپا نے آپ کو مارا ہے؟.........کیا وہ زندہ ہے"؟ ......"ہاں وہ زندہ ہے" اُس کی عمر کتنی ہوگی"؟ میں نے پوچھا '۱۵۵ سال!.........'آپ کی عمر کتنی ہے"؟۔ ۹۰ سال".......لیکن آپ کے پاپا نے آپ کو کیوں مارا (پیٹا) .... بزرگ نے روتے ہوئے کہا""مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے دادا (گرینڈ پاپا) کے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ چوری سے نکال لیا تھا.......کیا آپ کے گرینڈ پاپا ابھی زندہ ہیں"؟۔ وہ بولے"ہاں زندہ ہیں".........""اُن کی عمر کتنی ہے" جواب دیا"

۱۸۰سال اور انہوں نے اپنے ڈیڈی کا سگریٹ کیس اپنے ڈیڈی کے سرہانے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔"

اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاتا، میری نظر اُس بزرگ کے پیچھے محکمۂ سیاحت حکومتِ ازبکستان کے نصب شدہ سائن بورڈ پر پڑی، جس پر لکھا تھا" اس علاقے میں گزشتہ تین سو سال سے نہ کوئی بیمار پڑا اور نہ مرا۔اس سے مجھے وہ کہانیاں یاد آگئیں، جو میں نے قدیم داستانوں پر مبنی کتابوں میں پڑھی تھیں..........ان دیو مالیائی کہانیوں کے کردار ہو بہو اسی بزرگ جیسے رہے ہوں گے۔یہاں مجھے ایک کتاب میں پڑی ایک کہانی یاد آگئی، جب ایک شخص نے خالق سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "آپ نے نیک کام کرنے والوں لے لئے مرنے کے بعد جنت میں حوروں..........کا وعدہ کیا ہے۔لیکن ہم ان ہزاروں سال کی بوڑھی حوروں کو کیا کریں"؟ میں نے تھوڑی دیر میں اپنے دماغ پر زور دے کر سوچا کہ اس علاقے میں جو پریاں رہتی ہوں گی..........یقیناً وہ ۱۶اسال سے ۲۰۰سال تک کی عمر رکھتی ہوں گی۔مرد تو یہاں کے ضرور "دیو" سفید اور دیو سیاہ ہی ہوں گے۔عورتیں کیسی ہوں گی.......؟!۔

تاشقند یونیورسٹی کے وی، سی ڈاکٹر بابا جہاں غفوروف نے مجھے کہا "یہ جنوں بھوتوں اور پریوں کا دیس ہے..........بہت عجیب اور لاثانی ہے.................. آپ یہاں کے لوگوں سے مل کر خوش ہوں گے۔"......(۴اپریل ۱۹۷۱ء) ایک پروفیسر منصور نے کہا کہ یہاں کے لوگوں کی درازئ عمر کا راز یہ ہے کہ یہ روزانہ ۱۰ سے بیس کیلو میٹر پیدل چل کر جنگلوں میں جا کر کیلو دو کیلو انگور کھاتے ہیں۔

پیزار، ایزار، دستار

برصغیر ہی میں کچھ لوگ لفظ نمبرا کو "پوزار" بھی کہتے ہیں.....اور ایزار یا ازار کو یزار بھی کہتے ہیں، لیکن لفظِ نمبرا یعنی دستار چونکہ کسی غیر ملکی زبان کا لفظ ہے، اس لئے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے۔ دستار جسے بعض لوگ پگڑی اور کچھ صافہ بھی کہتے ہیں........دستار، پگڑی یا صافہ کا مقام ملبوساتِ انسانی میں افضل ترین مانا جاتا ہے۔ اسے اشرف المخلوقات کے سب سے زیادہ بلند و بالا مقام پر اعزاز و تکریم سے پہنا جاتا ہے......اسے جسم کے جس مقام پر رکھا جاتا ہے، اُس کا نام سر ہے.................. جو انسانی اعضاء میں مقدّم ترین عضو خیال کیا جاتا ہے۔ انسانی عقل اور شعور جسم کے اسی حصے میں محفوظ ہوتا ہے۔ اسی پر بادشاہ دستار کے ساتھ ہیرے جواہرات اور موتیوں سے مُزیّن تاج پہنتا ہے۔ جس کے سر پر تاج رہتا ہے، وہی ملک پر راج کرتا ہے........ بادشاہ، امیر، مشیر، وزیر، سپہ سالار اور حوالدار سب کے سر پر دستار، عزت و وقار، حکومت اور "علم و دانش" کا نشان بن کر رہتا ہے......تخت، دستار اور تاج تینوں کا چولی دامن کا

ساتھ ہوتا ہے۔ جس شخص کے پاس سر ہوتا ہے۔ لیکن دستار نہیں، اُس کی اہمیت اور وقعت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ خواہ اُس سر میں شعور، حکمت و دانش اور فکر و سوچ دنیا بھر کے "سرداروں" سے زیادہ کیوں نہ ہو.......... ننگے سر والا حکمران یعنی شہنشاہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی درزی ننگا سر ہو۔

پگڑیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ شاہی دستار، دستارِ کجکلاہی، طرے والی پگڑی شملے والی پگڑی، نیلی پگڑی، پیلی پگڑی سرخ اور سفید پگڑی، سبز اور زعفرانی پگڑی.......... مختلف رنگ اور اقسام کی پگڑیاں اہلِ دستار کی شخصیت اور اوقات کی غماز ہوتی ہیں۔ کچھ پگڑیاں سرکاری سٹیٹس اور کچھ پگڑیاں سماجی حیثیت اور مقام کا تعین کرتی ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے پولیس، حوالدار اور تھانیدار کی شناخت پگڑی سے ہوتی تھی.......... تاجر، عالم، فاضل، مولوی اور مبلغ بھی دستار اور کلاہ سے پہچانے جاتے تھے۔ انسانی اعضاء میں سب سے زیادہ اہم ترین اعضاء گردن اور ٹھوڑی سے اوپر ہی ہوتے ہیں، حالانکہ سر کے نیچے سینے میں دھڑکنے والا دل عشق و جنون کا حامل ہوتا ہے اور عقل و خرد جو سر میں ہوتے ہیں.......... عشق کا درجہ ہمیشہ بلند مانا گیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ

عقل است غلامِ من، عشق است امامِ من
من بندۂ آزادم،، من بندۂ آزادم

صبحِ ازل مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

ایک مسلم دینی عالم مستند فتاویٰ اور افکارِ شریعہ کے حوالہ جات سے ہمارے دل و

دماغ کے تاریک گوشوں کو منور کر دیا ہے کہ سر پر جو ٹوپی، دستار، کلاہ یا لباس پہن کر بازار یا شہر جاتے ہیں، وہی پہن کر ہمیں اللہ کے دربار میں نماز کے لئے بھی حاضر ہونا چاہیئے۔ (یہاں ہمیں ایک اہم سبق ملتا ہے کہ ہمیں پلاسٹک کی ٹوکری نما ٹوپی پہن کر نماز نہیں پڑھنی چاہیئے)۔

مختلف ممالک میں سر کا لباس مختلف ہوتا ہے۔ٹوپی، کلاہ، پگڑی، ہیٹ وغیرہ کئی قسم کی ٹوپیاں ہیں جو ہم سر پر پہنتے ہیں۔

اب ہم ایزار، ازار، یا ئیزار پر اُترتے ہیں.........یہ لباس.....لباسِ مستور کہلاتا ہے، جو ناف کے نیچے سے پاؤں کے ٹخنوں تک انسانی جسم کو مستور یا پوشیدہ رکھنا ہے۔ اسے ہم شلوار، پاجامہ اور تہہ بند بھی کہتے ہیں۔.......اس لباس کا پہننا ہر حالت میں ضروری اور لازمی ہے۔

دینی نقطہ نظر سے دیکھیں یا انسانی (سماجی) نقطۂ نگاہ سے...............

اشرف المخلوقات کے لئے ازار یا پاجامہ بے حد اہم اور ضروری ہے۔اگر ہم ازار نہ پہنیں تو پھر دستار کا بھی کوئی فائدہ نہیں..........اگر ہم کتنی ہی ''دستاریں'' کیوں نہ پہنیں ...... بنا شلوار یا پایزار کے ہم غیر مہذّب یا حیوان ہی مانے جائیں گے۔بغیر ایزار ہم نہ گھر کے اندر رہ سکتے ہیں نہ گھ سے باہر جا سکتے ہیں۔اس لئے دستار اور ایزار میں ازار ہی اہم ہے۔پگڑی اور ٹوپی کے بغیر ہم نماز پڑھ سکتے ہیں، یا کسی عبادت گاہ میں جا کر عبادت کر سکتے ہیں......لیکن ازار یا پاجامے کے بغیر کسی عبادت خانے میں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی ہے۔

اب ہم ذرا ایزار کی قسموں پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں جو''ایزار'' مُروّج ہیں اِن میں کون سے''ازار'' کی کیا اہمیت ہے۔مردوں

کی مستور جگہیں جس لباس سے ڈھکی چھپی رہیں جو پردے میں رہیں، جس لباں سے رہیں، وہ کوئی بھی ہو، اُس کا نام کوئی بھی کیوں نہ ہو، مختلف ممالک اور اقوام میں مُروّج ہو.........وہ ''یزار'' کے زمرے میں آتا ہے، اس میں پتلون، جھانگیہ، شلوار، پاجامہ۔چست یاڈھیلی دھوتی، لہنگا، لُونگی، احرام، وغیرہ.........اِن پر کوئی بحث نہیں۔

خواتین وحضرات دونوں کے لئے لباس کا ہونا یا ملبوس ہو کر رہنا سماج میں از بس ضروری ہے، ورنہ اُسے انسان تصوّر نہیں کیا جاسکتا ہے۔دنیا کے تمام ممالک میں جو لوگ بستے ہیں، وہ اس اصول سے متفق ہیں کہ یہی ایک واحد شرط ہے جس سے ہم انسان کیا! بلکہ آدمی کہلا سکتے ہیں۔ایزار کسی کپڑے کا ہو، چمڑے کا ہو، پلاسٹک یا ربڑ کا ہو، اون، یا سوت کا ہو.........سب جائز اور رواج العام کی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے۔

اب ہم ''پیزار'' یا ''پوزار'' پر آتے ہیں.........پیزار یا پوزار کو مختلف زبانوں میں مختلف نام سے پکارا جاتا ہے، مثلاً ''شوز، بوٹ، پاپوش، پوزار، چپل، سینڈل، جُوتی، کھورہ بانہ، کھڑاؤں ''گھاس کا، پُلہھور''، کھڑاؤں وغیرہ۔دنیا کے ہر ملک میں اس کا اپنا نام ہے۔دنیا کا ہر آدمی اسے پہنتا ہے۔یہ مختلف اقسام اور اشکال کا ہوتا ہے۔سردی میں گرم چمڑے، ربڑ، پلاسٹک اور فوم کے جوتے پہنے جاتے ہیں۔جوتے بنانے والے کو سراج اور اس کی مرمت کرنے والے کو موچی کہتے ہیں۔انگریزی میں اُنہیں شومیکر کہتے ہیں۔اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ یہ محنت کش پیشہ ور طبقے کے افراد ننگے چلتے یا پھٹے پرانے جوتے پہنتے ہیں۔جوتوں کے بارے میں ایک یورپی منصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ جب یہ پیروں میں ہوتے ہیں تو عزت وتکریم کی علامت سمجھے جاتے ہیں اگر کسی کے سر پر رکھے جائیں تو ذلت، بے عزتی اور سخت سزا کی علامت تصوّر کئے جاتے ہیں۔

حالانکہ جوتے پہننے کا مقصد محض پیروں کو، پیروں کے تلوؤں کو نہ صرف تیز، نوکیلی اشیاء سے بچانا اور آرام دینا مقصود ہوتا ہے، بلکہ سردی گرمی، کیڑے مکوڑوں، بچھوؤں اور سانپوں سے محفوظ رکھنا بھی ہوتا ہے۔ اعلیٰ حاکم اعلیٰ پائے کے چمڑے کے علاوہ سونے چاندی اور زرّین مواد کے جُوتے پہنا کرتے تھے۔ اب ساری دنیا کے امیر و حاکم قیمتی جُوتے پہنتے ہیں۔ غریب لوگ بھی کم معیار کے جُوتے اور چپلیں پہنتے ہیں۔ فقیر، درویش، صوفی اور عیاشی کی زندگی سے پرہیز کرنے والے، متقی، پرہیزگار یا تو سستے پھٹے پرانے جوتے پہنتے ہیں یا ننگے پیر چلتے ہیں۔ جُوتے ہر جگہ پہنے جاتے ہیں۔ صرف عبادت گاہوں میں جُوتے پہننا منع اور اور معیوب حرکت ہے۔ اسے لباس کا اہم اور لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ اگر تمہارے سر پر صاف اور بڑی دستار بھی ہو، ایزار بھی ہو لیکن جوتے نہ ہوں تم ہم گھر سے باہر نہیں جاتے، نہ بازار جاتے ہیں۔ نہ کسی دفتر یا مجلس میں بیٹھ سکتے ہیں.......... اگر یہ پیروں میں رہیں تو عزت و توقیر اور آرام کی کی علامت سمجھا جاتا ہے.......... اس کے برعکس اگر کسی کے سر پر جُوتوں کی بارش ہوتی ہوئی نظر آئے تو عزت کے معاملے میں اس سے بڑی بے عزتی کا تصور میں لانا ناممکن ہے۔.......... لہٰذا دستار، ایزار اور پیزار سب کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی لباس میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ایزار یا شلوار ہے، اس کے بعد پیزار اور آخر میں دستار ہے، حالانکہ دستار کو ہی عزت اور غیرت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی کی پٹائی یا دُھلائی جُوتوں اور لاتوں سے کی جائے .... لیکن پگڑی نہ گرنے پائے، تو وہ کہتا ہے "شکر اللہ کا .... مار تو بہت پڑی.......... جُوتوں سے بُری طرح پٹائی ہوئی، لیکن پگڑی کو نہ گرنے دیا۔ اللہ نے کسی نہ کسی طرح لاج رکھ ہی دی۔

زائد المیعاد یعنی وہ بزرگ مرد و خواتین جو Date of expiry کو پہنچ چکی ہیں، کہ میں نے گھوڑوں پر سوار کوہِ قاف کے جنگلوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس قسم کے بزرگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آپ نے ایسے خوبرو اور پُر کشش چہرے والے نوجوانوں کو بھی دیکھا ہوگا، جن کے سر پر ایک عدد بال بھی نہیں ہوتا یا پھر چاند ایکدم صاف ہے، اُنہیں عام طور پر گنجا کہا جاتا ہے.........لیکن تعظیمی کلمات میں اُنہیں "فارغ البال" بھی کہتے ہیں۔ فارغ البال ایسے شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو تمام Libilities سے آزاد اور فارغ ہو یا "خوشحال" ہو۔

ایک پُر ہجوم بازار میں ایک سو فی صد برہنہ شخص، جو انسان تھا، نظر آیا۔ ننگے گھوڑوں، کتوں اور دوسرے چوپایوں کو ہم روزانہ کئی مرتبہ الف ننگا دیکھتے ہیں اور بعض اوقات اُنہیں Couptletion یعنی جُفتی کرتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں، صرف اشرف المخلوقات کو جب بھی دیکھا، تہذیب صورت میں دیکھا..................

لیکن یہ کیا!، ایک آدمی سو فیصد ننگا انسانوں کے سمندر میں ایسے چل رہا ہے جیسے وہ اس سمندر میں غسل کر رہا ہو۔ میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک موچی جس کے پاس جُوتوں کے ڈھیر تھے۔ لیکن اُس کے پیر ننگے تھے..........اُس سے پوچھا......... اِس بھائی کو کیا پرابلم ہے؟ ......یہ ننگا کیوں ہے اور سماج نے اسے اس طرح سے ننگ دھڑنگ چلنے پھرنے کی اجازت کیوں دی ہے؟ تو اسی شومیکر نے کہا۔ یہ شخص ایک درزی تھا کچھ دن پہلے اچانک اس نے سارے کپڑے اُتار کر سامنے پھینک دیئے اور اعلان کر دیا کہ آج کے بعد وہ کسی کے لئے ملبوسات بنائے گا نہ خود کوئی کپڑا پہنے گا.......کہنے لگا جاؤ پانچ ہزار سال پیچھے اُس درزی کو ڈھونڈو جو اُس زمانے کے لوگوں کے پہننے کے کپڑے سیتا تھا۔

اے بھائیو! آج تک میں نے آپ کے جسم کو کپڑے سی کر ڈھانپا........اب میری باری ہے لوگوں کا اس درزی کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ یہ اس پیشے سے نفرت کرنے لگا ہے.......کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو پردے اور ستر پوشی کے لئے کپڑے سی کر دیئے۔ سردی سے بچنے کے لئے ہیں۔ اب میں پھر واپس اُس دن کو اپنا رہا ہوں جس دن میں پیدا ہوا تھا ان مجھے تختۂ غسل پر کفن پہنانا..........تب تک میں آزاد ہوں خبردار! مجھے حیوان نہ کہنا۔ میں اُسی حالت میں جیوں گا، جس میں مجھے میرے ....خالق نے پیدا کیا، میں نہ پاگل ہوں، نہ مجذوب، نہ فنافی اللہ نہ صوفی نہ راہب۔ ۱۳ مارچ..........دہلی کے چاندنی چوک میں میں نے ایسے ہی سو درزیوں کو دیکھا، جو ایک جلوس کی صورت میں کہیں جا رہے تھے۔ ایک سردار جی نے کہا.......یہ جین مت والے اس مندر میں جا رہے ہیں۔ ''کیا یہ لوگ بھی ننگے درزی بن رہے ہیں''۔ مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اپنی نگاہیں دوسری جانب موڑ دیں...........جس طرح جامع مسجد، لال قلعہ گوردوارہ چھٹی پادشاہی اور سناتن دھرم کا سب سے بڑے مندر کے علاوہ ایک بہت بڑا اگر جا گھر ہے، جہاں جو لوگ طرح طرح کے ملبوسات میں قید ہیں یہ سب ماں کے پیٹ سے الف ننگے ہی پیدا ہوئے تھے۔

DIL NAMMA

Inshaye (Urdu)

by

Raja Nazer Bunyari



مصنف کی دیگر تصنیفات:

۱۔ دوسرا آدم (افسانوی مجموعہ، اُردو)

۲۔ بانجھ ماں کا بیٹا (افسانوی مجموعہ، اُردو)

۳۔ یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں (افسانوی مجموعہ، اُردو)

۴۔ تمّل (تحقیقی وتنقیدی مضامین، پہاڑی)

۵۔ مِٹھی نیچھ (انشائیے وافسانے، پہاڑی)

۶۔ لعلاں دے بنجارے (مونوگراف میاں محمد بخش)

۷۔ پہاڑی زبان وادب دی تاریخ

۸۔ سیرت النعمان (پہاڑی ترجمہ)

۹۔ شاردا (سفرنامہ)

QALAB-O-QALAM PUBLISHERS TRIKANJAN, BUNYAR- BARAMULLA